فیض احمد فیض

'76

HaSnain Sialvi

کلیات

فیض احمد فیض

HaSnain Sialvi

This is the First Edition of the Collected Poems of Faiz Ahmed Faiz. It is limited to 750 copies numbered and signed by the author.

The frontispiece is from a drawing by Maqbool Fida Husain.

The book is printed on specially made Cream Cartridge paper and is hand bound in Nigerian goatskin. The endpapers are hand-marbled. The edges are gilded, and the spine and face decorated with real gold.

Commissioned by an admirer. Edited and published by Yasmin Hosain and Khwaja Shahid Hosain.

© Hosains Books 1982
25 Connaught Street
London W.2.

ISBN 0 946233 01 2

Printed by Nene Litho and bound by Woolnough Bookbinding, Wellingborough, England

HaSnain Sialvi

انتساب

آج کے نام

اور

آج کے غم کے نام

آج کا غم کہ ہے زندگی کے بھرے گلستاں سے خفا

زرد پتوں کا بن

زرد پتوں کا بن جو مرا دیس ہے

درد کی انجمن جو مرا دیس ہے

کلرکوں کی افسردہ جانوں کے نام

کرم خوردہ دلوں اور زبانوں کے نام

پوسٹ مینوں کے نام

تانگے والوں کے نام

ریل بانوں کے نام

HaSnain Sialvi

کارخانوں کے بھوکے جیالوں کے نام

بادشاہِ جہاں، والیِ ماسوا، نائب اللہ فی الارض

دہقان کے نام

جس کے ڈھوروں کو ظالم ہنکا لے گئے

جس کی بیٹی کو ڈاکو اٹھا لے گئے

ہاتھ بھر کھیت سے ایک انگشت پٹوار نے کاٹ لی

دوسری مالیے کے بہانے سے سرکار نے کاٹ لی

جس کی پگ زور والوں کے پاؤں تلے

دھجیاں ہو گئی

اُن دکھی ماؤں کے نام

رات میں جن کے بچے بلکتے ہیں اور

نیند کی مار کھائے ہوئے بازوؤں سے سنبھلتے نہیں

دکھ بتاتے نہیں
منتوں زاریوں سے بہلتے نہیں

ان حسیناؤں کے نام
جن کی آنکھوں کے گل
چلمنوں اور دریچوں کی بیلوں پہ بیکار کھل کھل کے
مرجھا گئے

ان بیاہتاؤں کے نام
جن کے بدن
بے محبت ریاکار سیجوں پہ سج سج کے اکتا گئے

بیواؤں کے نام
کٹڑیوں اور گلیوں محلوں کے نام
جن کی ناپاک خاشاک سے چاند

راتوں کو آ آ کے کرتا ہے اکثر وضو

جن کے سایوں میں کرتی ہے آہ و بکا

آنچلوں کی حنا

چوڑیوں کی کھنک

کاکلوں کی مہک

آرزومند سینوں کی اپنے پسینے میں جلنے کی بو

پڑھنے والوں کے نام

وہ جو اصحابِ طبل و علم

کے دروں پر کتاب اور قلم

کا تقاضا لئے ہاتھ پھیلائے پہنچے

اور لوٹ کر گھر نہ آئے

وہ معصوم جو بھولپن میں

وہاں اپنے ننھے چراغوں میں لو کی لگن
لے کے پہنچے جہاں
بٹ رہے تھے گھٹا ٹوپ بے انت راتوں کے سائے
اُن اسیروں کے نام
جن کے سینوں میں فردا کے شب تاب گوہر
جیل خانوں کی شوریدہ راتوں کی صرصر میں
جل جل کے انجم نما ہو گئے
آنے والے دنوں کے سفیروں کے نام
وہ جو خوشبوئے گل کی طرح
اپنے پیغام پر خود فدا ہو گئے

ناقل
منیر احمد منیر

HaSnain Sialvi

غزلیں

HaSnain Sialvi

نظمیں

HaSnain Sialvi

متفرق کلام

غزلیں

حُسن مرہونِ جوشِ بادۂ ناز
عِشق مِنّت کشِ فسُونِ نیاز

دل کا ہر تار لرزشِ پیہم
جاں کا ہر رِشتہ وقفِ سوز و گداز

سوزشِ دردِ دِل کِسے معلوم!
کون جانے کسی کے عشق کا راز

میری خاموشیوں میں لرزاں ہے
میرے نالوں کی گمشدہ آواز

ہو چکا عشق! اب ہوس ہی سہی
کیا کریں؟ فرض ہے ادائے نماز

تو ہے اور اِک تغافلِ پیہم
میں ہوں اور انتظارِ بے انداز

خوفِ ناکامیِ اُمید ہے فیضؔ
ورنہ دل توڑ دے طلسمِ مجاز

عشق مِنّت کشِ قرار نہیں
حُسن مجبورِ اِنتظار نہیں

تیری رنجش کی اِنتہا معلوم
حسرتوں کا مری شُمار نہیں

اپنی نظریں بکھیر دے ساقی!
مے باندازۂ خمار نہیں

زیرِ لب ہے ابھی تبسّمِ دوست
مُنتشر جلوۂ بہار نہیں

اپنی تکمیل کر رہا ہوں میں
ورنہ تجھ سے تو مجھ کو پیار نہیں

چارۂ انتظار کون کرے؟
تیری نفرت بھی استوار نہیں

فیضؔ، زندہ رہیں، وہ ہیں تو سہی
کیا ہوا گر وفا شعار نہیں؟

ہر حقیقت مجاز ہو جائے
کافروں کی نماز ہو جائے

دل رہینِ نیاز ہو جائے
بے کسی کارساز ہو جائے

منتِ چارہ ساز کون کرے
درد جب جاں نواز ہو جائے

عشق دل میں رہے تو رسوا ہو
لب پہ آئے تو راز ہو جائے

لطف کا انتظار کرتا ہوں
جور تا حدِّ ناز ہو جائے

عمر بے سود کٹ رہی ہے فیضؔ!
کاش اِفشائے راز ہو جائے!

اشعار

وہ عہدِ غم کی کاہشہائے بے حاصل کو کیا سمجھے
جو ان کی مختصر رُوداد بھی صبر آزما سمجھے

یہاں وابستگی، واں برہمی، کیا جانیے کیوں ہے
نہ ہم اپنی نظر سمجھے، نہ ہم اُن کی ادا سمجھے

فریبِ آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تری آوازِ پا سمجھے

تمہاری ہر نظر سے منسلک ہے رشتۂ ہستی
مگر یہ دُور کی باتیں کوئی نادان کیا سمجھے

نہ پوچھو عہدِ الفت کی، بس اک خوابِ پریشاں تھا
نہ دل کو راہ پر لائے، نہ دل کا مدعا سمجھے

ہمتِ التجا نہیں باقی
ضبط کا حوصلا نہیں باقی

اِک تری دید چھن گئی مجھ سے
ورنہ دُنیا میں کیا نہیں باقی

اپنی مشقِ ستم سے ہاتھ نہ کھینچ
میں نہیں یا وفا نہیں باقی

تیری چشمِ اَلم نواز کی خیر
دِل میں کوئی گِلا نہیں باقی

ہو چکا ختم عہدِ ہجر و وصال
زندگی میں مزا نہیں باقی

چشمِ میگوں ذرا ادھر کر دے
دستِ قدرت کو بے اثر کر دے

تیز ہے آج دردِ دل، ساقی!
تلخیِ مے کو تیز تر کر دے

جوشِ وحشت ہے تشنہ کام ابھی
چاکِ دامن کو تا جگر کر دے

میری قسمت سے کھیلنے والے
مجھ کو قسمت سے بے خبر کر دے

لُٹ رہی ہے مری متاعِ نیاز
کاش وہ اس طرف نظر کر دے!

فیضؔ تکمیلِ آرزو معلوم!
ہو سکے تو یونہی بسر کر دے

دونوں جہان تیری محبت میں ہار کے
وہ جا رہا ہے کوئی شبِ غم گذار کے

ویراں ہے میکدہ، خُم و ساغر اُداس ہیں
تم کیا گئے کہ رُوٹھ گئے دِن بہار کے

اِک فرصتِ گناہ ملی وہ بھی چار دِن
دیکھے ہیں ہم نے حوصلے پروردگار کے!

دنیا نے تیری یاد سے بیگانہ کر دیا
تجھ سے بھی دلفریب ہیں غم روزگار کے

بھولے سے مسکرا تو دیے تھے وہ آج فیضؔ!
مت پوچھ ولولے دلِ ناکردہ کار کے!

وفائے وعدہ نہیں، وعدۂ دِگر بھی نہیں
وہ مجھ سے روٹھے تو تھے، لیکن اس قدر بھی نہیں!

برس رہی ہے حریمِ ہوس میں دولتِ حسن
گدائے عشق کے کاسے میں اِک نظر بھی نہیں

نہ جانے کس لیے اُمیدوار بیٹھا ہوں
اِک ایسی راہ پہ جو تیری رہگزر بھی نہیں

نگاہِ شوق سرِ بزم بے حجاب نہ ہو
وہ بے خبر ہی سہی، اتنے بے خبر بھی نہیں

یہ عہدِ ترکِ محبت ہے کس لیے آخر؟
سکونِ قلب اِدھر بھی نہیں، اُدھر بھی نہیں

رازِ اُلفت چھپا کے دیکھ لیا
دل بہت کچھ جلا کے دیکھ لیا

اور کیا دیکھنے کو باقی ہے؟
آپ سے دل لگا کے دیکھ لیا

وہ مرے ہو کے بھی مرے نہ ہوئے
ان کو اپنا بنا کے دیکھ لیا

آج ان کی نظر میں کچھ ہم نے
سب کی نظریں بچا کے دیکھ لیا

فیضؔ تکمیلِ غم بھی ہو نہ سکی
عشق کو آزما کے دیکھ لیا

کچھ دن سے انتظارِ سوالِ دگر میں ہے
وہ مضمحل حیا جو کسی کی نظر میں ہے

سیکھی یہیں مرے دلِ کافر نے بندگی
ربِّ کریم ہے تو تری رہگزر میں ہے

ماضی میں جو مزا مری شام و سحر میں تھا
اب وہ فقط تصورِ شام و سحر میں ہے

کیا جانے کس کو کس سے ہے اب داد کی طلب
وہ غم جو میرے دل میں ہے، تیری نظر میں ہے

پھر حریفِ بہار ہو بیٹھے
جانے کس کس کو آج رو بیٹھے!

تھی، مگر اتنی رائگاں بھی نہ تھی
آج کچھ زندگی سے کھو بیٹھے

تیرے در تک پہنچ کے لوٹ آئے
عشق کی آبرو ڈبو بیٹھے

ساری دنیا سے دُور ہو جائے
جو ذرا تیرے پاس ہو بیٹھے

نہ گئی تیری بے رُخی نہ گئی
ہم تری آرزو بھی کھو بیٹھے

فیضؔ، ہوتا رہے جو ہوتا ہے
شعر لکھتے رہا کرو بیٹھے

پھر لوٹا ہے خورشیدِ جہانتاب سفر سے
پھر نورِ سحر دست و گریباں ہے سحر سے

پھر آگ بھڑکنے لگی ہر سازِ طرب میں
پھر شعلے لپکنے لگے ہر دیدۂ تر سے

پھر نکلا ہے دیوانہ کوئی پھونک کے گھر کو
کچھ کہتی ہے ہر راہ ہر اک راہگذر سے

وہ رنگ ہے اِمسال گلستاں کی فضا کا
اوجھل ہوئی دیوارِ قفس حدِ نظر سے

ساغر تو کھنکتے ہیں، شراب آئے نہ آئے
بادل تو گرجتے ہیں، گھٹا برسے نہ برسے

پاپوش کی کیا فکر ہے، دستار سنبھالو
پایاب ہے جو موج، گزر جائے گی سر سے

کئی بار اس کا دامن بھر دیا حسنِ دو عالم سے
مگر دل ہے کہ اس کی خانہ ویرانی نہیں جاتی

کئی بار اس کی خاطر ذرّے ذرّے کا جگر چیرا
مگر یہ چشمِ حیراں جس کی حیرانی نہیں جاتی

نہیں جاتی متاعِ لعل و گوہر کی گراں یابی
متاعِ غیرت و ایماں کی ارزانی نہیں جاتی

مری چشمِ تن آساں کو بصیرت مل گئی جب سے
بہت جانی ہوئی صورت بھی پہچانی نہیں جاتی

سرِ خسرو سے نازِ کجکلاہی چھن بھی جاتا ہے
کلاہِ خسروی سے بوئے سلطانی نہیں جاتی

بجز دیوانگی واں اور چارہ ہی کہو کیا ہے
جہاں عقل و خرد کی ایک بھی مانی نہیں جاتی؟

نصیب آزمانے کے دن آ رہے ہیں
قریب ان کے آنے کے دن آ رہے ہیں

جو دل سے کہا ہے، جو دل سے سنا ہے
سب ان کو سنانے کے دن آ رہے ہیں

ابھی سے دل و جاں سر راہ رکھ دو
کہ لٹنے لٹانے کے دن آ رہے ہیں

ٹپکنے لگی اُن نگاہوں سے مستی
نگاہیں چرانے کے دن آ رہے ہیں

صبا پھر ہمیں پوچھتی پھر رہی ہے
چمن کو سجانے کے دن آ رہے ہیں

چلو فیضؔ، پھر سے کہیں دِل لگائیں
سنا ہے ٹھکانے کے دن آ رہے ہیں

کبھی کبھی یاد میں اُبھرتے ہیں نقشِ ماضی مٹے مٹے سے
وہ آزمائش دل و نظر کی، وہ قُربتیں سی، وہ فاصلے سے

کبھی کبھی آرزو کے صحرا میں آ کے رُکتے ہیں قافلے سے
وہ ساری باتیں لگاؤ کی سی، وہ سارے عنوان وصال کے سے

نگاہ و دل کو قرار کیسا، نشاط و غم میں کمی کہاں کی!
وہ جب ملے ہیں تو ان سے ہر بار کی ہے اُلفت نئے سرے سے

بہت گراں ہے یہ عیشِ تنہا، کہیں سبک تر، کہیں گوارا
وہ دردِ پنہاں کہ ساری دنیا رفیق تھی جس کے واسطے سے

تمہیں کہو رند و محتسب میں ہے آج شب کون فرق ایسا
یہ آ کے بیٹھے ہیں میکدے میں، وہ اٹھ کے آئے ہیں میکدے سے

تم آئے ہو نہ شبِ انتظار گزری ہے
تلاش میں ہے سحر، بار بار گزری ہے

جنوں میں جتنی بھی گزری، بکار گزری ہے
اگرچہ دل پہ خرابی ہزار گزری ہے

ہوئی ہے حضرتِ ناصح سے گفتگو جس شب
وہ شب ضرور سرِ کوئے یار گزری ہے

وہ بات سارے فسانے میں جس کا ذکر نہ تھا
وہ بات ان کو بہت ناگوار گزری ہے

نہ گل کھلے ہیں، نہ ان سے ملے، نہ مے پی ہے
عجیب رنگ میں اب کے بہار گزری ہے!

چمن میں غارتِ گلچیں سے جانے کیا گزری
قفس سے آج صبا بے قرار گزری ہے

تمہاری یاد کے جب زخم بھرنے لگتے ہیں
کسی بہانے تمہیں یاد کرنے لگتے ہیں

حدیثِ یار کے عنواں نکھرنے لگتے ہیں
تو ہر حریم میں گیسو سنورنے لگتے ہیں

ہر اجنبی ہمیں محرم دکھائی دیتا ہے
جو اب بھی تیری گلی سے گزرنے لگتے ہیں

صبا سے کرتے ہیں غربت نصیب ذکرِ وطن
تو چشمِ صبح میں آنسو ابھرنے لگتے ہیں

وہ جب بھی کرتے ہیں اس نطق و لب کی بخیہ گری
فضا میں اور بھی نغمے بکھرنے لگتے ہیں

درِ قفس پہ اندھیرے کی مہر لگتی ہے
تو فیضؔ، دل میں ستارے اُترنے لگتے ہیں

شفق کی راکھ میں جل بجھ گیا ستارۂ شام
شبِ فراق کے گیسو فضا میں لہرائے

کوئی پکارو، کہ اک عمر ہونے آئی ہے
فلک کو قافلۂ روز و شام ٹھہرائے

یہ ضد ہے یادِ حریفانِ بادہ پیما کی
کہ شب کو چاند نہ نکلے، نہ دن کو ابر آئے

صبا نے پھر درِ زنداں پہ آکے دی دستک
سحر قریب ہے، دل سے کہو نہ گھبرائے

عجزِ اہلِ ستم کی بات کرو
عشق کے دم قدم کی بات کرو

بزمِ اہلِ طرب کو شرماؤ
بزمِ اصحابِ غم کی بات کرو

بزمِ ثروت کے خوش نشینوں سے
عظمتِ چشمِ نم کی بات کرو

ہے وہی بات یوں بھی اور یوں بھی
تم ستم یا کرم کی بات کرو

خیر، ہیں اہلِ دیر جیسے ہیں
آپ اہلِ حرم کی بات کرو

ہجر کی شب تو کٹ ہی جائے گی
روزِ وصلِ صنم کی بات کرو

جان جائیں گے جاننے والے
فیضؔ، فرہاد و جم کی بات کرو

نذرِ سودا

فکرِ دلداریِ گلزار کروں یا نہ کروں؟
ذکرِ مرغانِ گرفتار کروں یا نہ کروں؟

قصۂ سازشِ اغیار کہوں یا نہ کہوں؟
شکوۂ یارِ طرحدار کروں یا نہ کروں؟

جانے کیا وضع ہے اب رسمِ وفا کی، اے دل!
وضعِ دیرینہ پہ اصرار کروں یا نہ کروں؟

جانے کس رنگ میں تفسیر کریں اہلِ ہوس
مدحِ زلف و لب و رخسار کروں یا نہ کروں؟

یوں بہار آئی ہے اِمسال کہ گلشن میں صبا
پوچھتی ہے گزر اس بار کروں یا نہ کروں

گویا اس سوچ میں ہے، دل میں لہو بھر کے گلاب
دامن و جَیب کو گلنار کروں یا نہ کروں؟

ہے فقط مرغِ غزل خواں کہ جسے فکر نہیں
معتدل گرمیِ گفتار کروں یا نہ کروں

گرانیٔ شبِ ہجراں دو چند کیا کرتے
علاجِ درد ترے درد مند کیا کرتے

وہیں لگی ہے جو نازک مقام تھے دل کے
یہ فرق دستِ عدو کے گزند کیا کرتے

جگہ جگہ پہ تھے ناصح تو کُو بکُو دلبر
اِنہیں پسند اُنہیں ناپسند کیا کرتے

ہمیں نے روک لیا پنجۂ جنوں، ورنہ
ہمیں اسیر یہ کوتہ کمند کیا کرتے

جنھیں خبر تھی کہ شرطِ نواگری کیا ہے
وہ خوش نوا گلہ قید و بند کیا کرتے

گوئے عشق کو دار و رسن پہنچ نہ سکے
تو لوٹ آئے ترے سربلند کیا کرتے

وہیں ہے دل کے قرائن تمام کہتے ہیں
وہ اک خلش کہ جسے تیرا نام کہتے ہیں

تم آ رہے ہو کہ بجتی ہیں میری زنجیریں
نہ جانے کیا مرے دیوار و بام کہتے ہیں!

یہی کنارِ فلک کا سیہ تریں گوشہ
یہی ہے مطلعِ ماہِ تمام کہتے ہیں

پیو کہ مفت لگا دی ہے خونِ دل کی کشید
گراں ہے اب کے مئے لالہ فام کہتے ہیں

فقیہِ شہر سے مے کا جواز کیا پوچھیں
کہ چاندنی کو بھی حضرت حرام کہتے ہیں!

نوائے مرغ کو کہتے ہیں اب زیانِ چمن
کھلے نہ پھول اسے انتظام کہتے ہیں

کہو تو ہم بھی چلیں فیضؔ، اب نہیں سرِ دار
وہ فرقِ مرتبۂ خاص و عام کہتے ہیں

رنگ پیراہن کا، خوشبو زلف لہرانے کا نام
موسمِ گل ہے تمہارے بام پر آنے کا نام

دوستو، اس چشم و لب کی کچھ کہو جس کے بغیر
گلستاں کی بات رنگیں ہے نہ میخانے کا نام

پھر نظر میں پھول مہکے، دل میں پھر شمعیں جلیں
پھر تصور نے لیا اُس بزم میں جانے کا نام

دلبری ٹھہرا زبانِ خلق کھلوانے کا نام
اب نہیں لیتے پری رُو زلف بکھرانے کا نام

اب کسی لیلیٰ کو بھی اقرارِ محبوبی نہیں
ان دنوں بدنام ہے ہر ایک دیوانے کا نام

محتسب کی خیر، اونچا ہے اسی کے فیض سے
رند کا، ساقی کا، مے کا، خُم کا، پیمانے کا نام

ہم سے کہتے ہیں چمن والے غریبانِ چمن!
تم کوئی اچھا سا رکھ لو اپنے ویرانے کا نام

فیضؔ ان کو ہے تقاضائے وفا ہم سے جنہیں
آشنا کے نام سے پیارا ہے بیگانے کا نام

دل میں اب یوں ترے بھولے ہوئے غم آتے ہیں
جیسے بچھڑے ہوئے کعبے میں صنم آتے ہیں

ایک اک کر کے ہوئے جاتے ہیں تارے روشن
میری منزل کی طرف تیرے قدم آتے ہیں

رقصِ مے تیز کرو، ساز کی لے تیز کرو
سُوئے میخانہ سفیرانِ حرم آتے ہیں!

کچھ ہمیں کو نہیں احسان اٹھانے کا دماغ
وہ تو جب آتے ہیں مائل بہ کرم آتے ہیں

اور کچھ دیر نہ گزرے شبِ فرقت سے کہو
دل بھی کم دُکھتا ہے، وہ یاد بھی کم آتے ہیں

اب وہی حرفِ جنوں سب کی زباں ٹھہری ہے
جو بھی چل نکلی ہے، وہ بات کہاں ٹھہری ہے!

آج تک شیخ کے اکرام میں جو شے تھی حرام
اب وہی دشمنِ دیں، راحتِ جاں ٹھہری ہے

ہے خبر گرم کہ پھرتا ہے گریزاں ناصح
گفتگو آج سرِ کوئے بتاں ٹھہری ہے

ہے وہی عارضِ لیلیٰ، وہی شیریں کا دہن
نگہِ شوق گھڑی بھر کو جہاں ٹھہری ہے

وصل کی شب تھی تو کس درجہ سبک گزری تھی
ہجر کی شب ہے تو کیا سخت گراں ٹھہری ہے!

بکھری اک بار تو ہاتھ آئی ہے کب موجِ شمیم؟
دل سے نکلی ہے تو کب لب پہ فغاں ٹھہری ہے؟

دستِ صیاد بھی عاجز ہے کفِ گلچیں بھی
بُوئے گل ٹھہری نہ بلبل کی زباں ٹھہری ہے

آتے آتے یونہی دم بھر کو رُکی ہوگی بہار
جاتے جاتے یونہی پل بھر کو خزاں ٹھہری ہے

ہم نے جو طرزِ فغاں کی ہے قفس میں ایجاد
فیضؔ گلشن میں وہی طرزِ بیاں ٹھہری ہے

آئے کچھ ابر، کچھ شراب آئے
اس کے بعد آئے جو عذاب آئے

ق

بامِ مینا سے ماہتاب اترے
دستِ ساقی میں آفتاب آئے

ہر رگِ خوں میں پھر چراغاں ہو
سامنے پھر وہ بے نقاب آئے

عمر کے ہر ورق پہ دل کو نظر
تیری مہر و وفا کے باب آئے

ق

کر رہا تھا غمِ جہاں کا حساب
آج تم یاد بے حساب آئے

نہ گئی تیرے غم کی سرداری
دل میں یوں روز انقلاب آئے

جل اٹھے بزمِ غیر کے در و بام
جب بھی ہم خانماں خراب آئے

ق

اس طرح اپنی خامشی گونجی
گویا ہر سمت سے جواب آئے

فیضؔ، تھی راہ سر بسر منزل
ہم جہاں پہنچے، کامیاب آئے

نذرِ غالب

کسی گماں پہ توقع زیادہ رکھتے ہیں
پھر آج کوئے بتاں کا اِرادہ رکھتے ہیں

بہار آئے گی جب آئے گی، یہ شرط نہیں
کہ تشنہ کام رہیں، گرچہ بادہ رکھتے ہیں

تری نظر کا گِلہ کیا، جو ہے گِلہ دِل کو
تو ہم سے ہے، کہ تمنا زیادہ رکھتے ہیں

نہیں شراب سے رنگیں تو غرقِ خوں ہیں کہ ہم
خیالِ وضعِ قمیص و لبادہ رکھتے ہیں

غمِ جہاں ہو، غمِ یار ہو کہ تیرِ ستم
جو آئے، آئے کہ ہم دل کشادہ رکھتے ہیں

جوابِ واعظِ چابک زباں میں فیضؔ ہمیں
یہی بہت ہیں جو دو حرف سادہ رکھتے ہیں

تیری صورت جو دلنشیں کی ہے
آشنا شکل ہر حسیں کی ہے

حسن سے دل لگا کے ہستی کی
ہر گھڑی ہم نے آتشیں کی ہے

صبحِ گل ہو کہ شامِ میخانہ
مدح اس روئے نازنیں کی ہے

شیخ سے بے ہراس ملتے ہیں
ہم نے توبہ ابھی نہیں کی ہے

ذکرِ دوزخ ، بیانِ حور و قصور
بات گویا یہیں کہیں کی ہے

اشک تو کچھ بھی رنگ لا نہ سکے
خوں سے تر آج آستیں کی ہے

کیسے مانیں حرم کے سہل پسند
رسم جو عاشقوں کے دیں کی ہے

فیضؔ اوجِ خیال سے ہم نے
آسماں سندھ کی زمیں کی ہے

یادِ غـزال چشماں ، ذکرِ سمن عذاراں
جب چاہا کر لیا ہے کُنجِ قفس بہاراں

آنکھوں میں دردمندی، ہونٹوں پہ عذر خواہی
جانانہ وار آئی شامِ فراقِ یاراں

ناموسِ جان و دِل کی بازی لگی تھی، ورنہ
آساں نہ تھی کچھ ایسی راہِ وفا شعاراں!

مجرم ہو خواہ کوئی ، رہتا ہے ناصحوں کا
رُوئے سخن ہمیشہ سُوئے جگر فگاراں

ہے اب بھی وقت زاہد، ترمیمِ زُہد کر لے
سوئے حرم چلا ہے انبوہِ بادہ خواراں!

شاید قریب پہنچی صبحِ وصال ہمدم
موجِ صبا لیے ہے خوشبوے خوش کناراں

ہے اپنی کشتِ ویراں سرسبز اس یقیں سے
آئیں گے اس طرف بھی اک روز ابر و باراں

آئے گی، فیضؔ، اک دن بادِ بہار لے کر
تسلیمِ مے فروشاں، پیغامِ مے گساراں

قرضِ نگاہِ یار ادا کر چکے ہیں ہم
سب کچھ نثارِ راہِ وفا کر چکے ہیں ہم

کچھ امتحانِ دستِ جفا کر چکے ہیں ہم
کچھ ان کی دسترس کا پتا کر چکے ہیں ہم

اب احتیاط کی کوئی صورت نہیں رہی
قاتل سے رسم و راہ سوا کر چکے ہیں ہم

دیکھیں ہے کون کون، ضرورت نہیں رہی
کوے ستم میں سب کو خفا کر چکے ہیں ہم

اب اپنا اختیار ہے، چاہیں جہاں چلیں
رہبر سے اپنی راہ جدا کر چکے ہیں ہم

ان کی نظر میں، کیا کریں، پھیکا ہے اب بھی رنگ
جتنا لہُو تھا، صرفِ قبا کر چکے ہیں ہم

کچھ اپنے دل کی خُو کا بھی شکرانہ چاہیے
سو بار اُن کی خُو کا گِلا کر چکے ہیں ہم

شیخ صاحب سے رسم و راہ نہ کی
شکر ہے زندگی تباہ نہ کی

تجھ کو دیکھا تو سیر چشم ہوئے
تجھ کو چاہا تو اور چاہ نہ کی

تیرے دستِ ستم کا عجز نہیں
دل ہی کافر تھا جس نے آہ نہ کی

تھے شبِ ہجر کام اور بہت
ہم نے فکرِ دلِ تباہ نہ کی

کون قاتل بچا ہے شہر میں، فیضؔ
جس سے یاروں نے رسم و راہ نہ کی

سب قتل ہو کے تیرے مقابل سے آئے ہیں
ہم لوگ سرخ رُو ہیں، کہ منزل سے آئے ہیں

شمعِ نظر، خیال کے انجم، جگر کے داغ
جتنے چراغ ہیں تری محفل سے آئے ہیں

اٹھ کر تو آ گئے ہیں تری بزم سے، مگر
کچھ دل ہی جانتا ہے کہ کس دل سے آئے ہیں!

ہر اک قدم اجل تھا، ہر اک گام زندگی
ہم گھوم پھر کے کوچۂ قاتل سے آئے ہیں

بادِ خزاں کا شکر کرو، فیضؔ، جس کے ہاتھ
نامے کسی بہار شمائل سے آئے ہیں!

ستم کی رسمیں بہت تھیں لیکن، نہ تھی تری انجمن سے پہلے
سزا خطائے نظر سے پہلے، عتاب جُرمِ سخن سے پہلے

جو چل سکو تو چلو کہ راہِ وفا بہت مختصر ہوئی ہے
مقام ہے اب کوئی نہ منزل، فرازِ دار و رسن سے پہلے

نہیں رہی اب جنوں کی زنجیر پر وہ پہلی اجارہ داری
گرفت کرتے ہیں کرنے والے خرد پہ دیوانہ پن سے پہلے

کرے کوئی تیغ کا نظارا، اب ان کو یہ بھی نہیں گوارا
بضد ہے قاتل کہ جانِ بسمل فگار ہو جسم و تن سے پہلے

غرورِ سرو و سمن سے کہہ دو کہ پھر وہی تاجدار ہوں گے
جو خار و خس والیِ چمن تھے عروجِ سرو و سمن سے پہلے

اِدھر تقاضے ہیں مصلحت کے، اُدھر تقاضائے دردِ دل ہے
زباں سنبھالیں کہ دل سنبھالیں اسیر ذکرِ وطن سے پہلے

حیدرآباد جیل
۲۲-۱۴ مئی ۱۹۵۴ء

شامِ فراق، اب نہ پوچھ، آئی اور آ کے ٹل گئی
دل تھا کہ پھر بہل گیا، جاں تھی کہ پھر سنبھل گئی

بزمِ خیال میں ترے حُسن کی شمع جل گئی
درد کا چاند بُجھ گیا، ہجر کی رات ڈھل گئی

جب تجھے یاد کر لیا، صبح مہک مہک اُٹھی
جب ترا غم جگا لیا، رات مچل مچل گئی

دل سے تو ہر معاملہ کر کے چلے تھے صاف ہم
کہنے میں ان کے سامنے بات بدل بدل گئی

آخرِ شب کے ہم سفر فیضؔ، نجانے کیا ہوئے
رہ گئی کس جگہ صبا، صبح کدھر نکل گئی

جناح ہسپتال کراچی ۔ جولائی ۵۳ء

رہِ خزاں میں تلاشِ بہار کرتے رہے
شبِ سیہ سے طلب حُسنِ یار کرتے رہے

خیالِ یار کبھی ذکرِ یار کرتے رہے
اسی متاع پہ ہم روزگار کرتے رہے

نہیں شکایتِ ہجراں، کہ اس وسیلے سے
ہم ان سے رشتۂ دل اُستوار کرتے رہے

وہ دن کہ کوئی بھی جب وجہِ انتظار نہ تھی
ہم ان میں تیرا سوا انتظار کرتے رہے

ہم اپنے راز پہ نازاں تھے، شرمسار نہ تھے
ہر ایک سے سخنِ راز دار کرتے رہے

ضیائے بزمِ جہاں بار بار ماند ہوئی
حدیثِ شعلہ رُخاں بار بار کرتے رہے

انھیں کے فیض سے بازارِ عقل روشن ہے
جو گاہ گاہ جُنوں اختیار کرتے رہے

جناح ہسپتال کراچی
۲۱۔ اگست

بات بس سے نکل چلی ہے
دل کی حالت سنبھل چلی ہے

اب جنوں حد سے بڑھ چلا ہے
اب طبیعت بہل چلی ہے

اشک خوناب ہو چلے ہیں
غم کی رنگت بدل چلی ہے

یا یونہی بجھ رہی ہیں شمعیں
یا شبِ ہجر ٹل چلی ہے

لاکھ پیغام ہو گئے ہیں
جب صبا ایک پل چلی ہے

جاؤ، اب سو رہو ستارو!
درد کی رات ڈھل چلی ہے

منٹگمری جیل
۲۱ نومبر ۵۴ء

شاخ پر خونِ گل رواں ہے وہی
شوخیِ رنگِ گلستاں ہے وہی

سر وہی ہے تو آستاں ہے وہی
جاں وہی ہے تو جانِ جاں ہے وہی

اب جہاں مہرباں نہیں کوئی
کوچۂ یارِ مہرباں ہے وہی

برق سو بار گر کے خاک ہوئی
رونقِ خاکِ آشیاں ہے وہی

آج کی شب وصال کی شب ہے
دل سے ہر روز داستاں ہے وہی

چاند تارے اِدھر نہیں آتے
ورنہ زنداں میں آسماں ہے وہی

شگری جمیل

کب یاد میں تیرا ساتھ نہیں، کب ہات میں تیرا ہات نہیں
صد شکر کہ اپنی راتوں میں اب ہجر کی کوئی رات نہیں!

مشکل ہیں اگر حالات وہاں، دل بیچ آئیں، جاں دے آئیں
دل والو. کوچۂ جاناں میں کیا ایسے بھی حالات نہیں؟

جس دھج سے کوئی مقتل میں گیا، وہ شان سلامت رہتی ہے،
یہ جان تو آنی جانی ہے، اس جاں کی تو کوئی بات نہیں

میدانِ وفا دربار نہیں، یاں نام و نسب کی پوچھ کہاں
عاشق تو کسی کا نام نہیں، کچھ عشق کسی کی ذات نہیں

گر بازی عشق کی بازی ہے، جو چاہو لگا دو ڈر کیسا
گر جیت گئے تو کیا کہنا! ہارے بھی تو بازی مات نہیں

منٹگمری جیل

ہم پہ تمہاری چاہ کا الزام ہی تو ہے
دُشنام تو نہیں ہے یہ اکرام ہی تو ہے

کرتے ہیں جس پہ طعن، کوئی جرم تو نہیں
شوقِ فُضُول و اُلفتِ ناکام ہی تو ہے

دل مدّعی کے حرفِ مَلامت سے شاد ہے
اے جانِ جاں، یہ حرف ترا نام ہی تو ہے

دل نا امید تو نہیں ، ناکام ہی تو ہے
لمبی ہے غم کی شام، مگر شام ہی تو ہے

دستِ فلک میں گردشِ تقدیر تو نہیں
دستِ فلک میں گردشِ ایّام ہی تو ہے

آخر تو ایک روز کرے گی نظر وفا
وہ یارِ خوش خصال سرِ بام ہی تو ہے

بھیگی ہے رات فیضؔ غزل ابتدا کرو
وقتِ سرود، درد کا ہنگام ہی تو ہے

منٹگمری جیل
۹۔ مارچ ۵۴ء

گلوں میں رنگ بھرے بادِ نَو بہار چلے
چلے بھی آؤ کہ گلشن کا کاروبار چلے

قفس اُداس ہے، یارو، صبا سے کچھ تو کہو
کہیں تو بہرِ خدا آج ذکرِ یار چلے

کبھی تو صبح ترے کنجِ لب سے ہو آغاز
کبھی تو شب سرِ کاکُل سے مشکبار چلے

بڑا ہے درد کا رشتہ، یہ دل غریب سہی
تمہارے نام پہ آئیں گے غمگسار چلے

جو ہم پہ گزری سو گزری مگر، شبِ ہجراں!
ہمارے اشک تری عاقبت سنوار چلے

حضورِ یار ہوئی دفترِ جنوں کی طلب
گرہ میں لے کے گریباں کا تار تار چلے

مقام، فیضؔ، کوئی راہ میں جچا ہی نہیں
جو کوئے یار سے نکلے، تو سوئے دار چلے

منٹگمری جیل
۲۹۔جنوری ۱۹۵۴ء

کچھ محتسبوں کی خلوت میں ، کچھ واعظ کے گھر جاتی ہے
ہم بادہ کشوں کے حصّے کی، اب جام میں کم تر جاتی ہے

یوں عرض و طلب سے کب اے دل، پتھر دل پانی ہوتے ہیں
تم لاکھ رضا کی خُو ڈالو ، کب خُوئے ستمگر جاتی ہے

بیدادگروں کی بستی ہے یاں، داد کہاں، خیرات کہاں؟
سر پھوڑتی پھرتی ہے ناداں، فریاد جو در در جاتی ہے

ہاں، جاں کے زیاں کی ہم کو بھی تشویش ہے لیکن کیا کیجے
ہر رہ جو اُدھر کو جاتی ہے، مقتل سے گزر کر جاتی ہے

اب کوچۂ دلبر کا رہرو ، رہزن بھی بنے تو بات بنے
پہرے سے عدو ٹلتے ہی نہیں، اور رات برابر جاتی ہے

ہم اہلِ قفس تنہا بھی نہیں، ہر روز نسیمِ صبحِ وطن
یادوں سے معطر آتی ہے، اشکوں سے منوّر جاتی ہے

منٹگمری جیل
۱۷- جون ۵۴ء

گرمیِ شوقِ نظارہ کا اثر تو دیکھو!
گُل کھِلے جاتے ہیں ، وہ سایۂ در تو دیکھو!

ایسے ناداں بھی نہ تھے جاں سے گزرنے والے
ناصحو ، پند گرو ، راہگزر تو دیکھو!

وہ تو وہ ہے تمہیں ہو جائیگی اُلفت مجھ سے
اِک نظر تم مرا محبوبِ نظر تو دیکھو

وہ جو اب چاک گریباں بھی نہیں کرتے ہیں
دیکھنے والو کبھی اُن کا جگر تو دیکھو!

دامنِ درد کو گلزار بنا رکھا ہے
آؤ اِک دن دلِ پُرخوں کا ہُنر تو دیکھو

صبح کی طرح جھمکتا ہے شبِ غم کا اُفق
فیضؔ، تابندگیِ دیدۂ تر تو دیکھو

منٹگمری جیل
۴- مارچ ۵۷ء

صبح کی آج جو رنگت ہے، وہ پہلے تو نہ تھی
کیا خبر آج خراماں سرِ گلزار ہے کون

شام گلنار ہوئی جاتی ہے، دیکھو تو سہی
یہ جو نکلا ہے لیے مشعلِ رخسار، ہے کون

رات مہکی ہوئی آئی ہے کہیں سے، پوچھو
آج بکھرائے ہوئے زلفِ طرحدار ہے کون

پھر درِ دل پہ کوئی دینے لگا ہے دستک
جانیے پھر دلِ وحشی کا طلبگار ہے کون

جناح ہسپتال کراچی
جولائی ۵۳ء

تری اُمید، ترا انتظار جب سے ہے
نہ شب کو دن سے شکایت نہ دن کو شب سے ہے

کسی کا درد ہو، کرتے ہیں تیرے نام رقم
گلہ ہے جو بھی کسی سے، ترے سبب سے ہے

ہوا ہے جب سے دلِ ناصبور بے قابو
کلام تجھ سے نظر کو بڑے ادب سے ہے

اگر شرر ہے تو بھڑکے، جو پھول ہے تو کھلے
طرح طرح کی طلب، تیرے رنگِ لب سے ہے

کہاں گئے شبِ فرقت کے جاگنے والے
ستارۂ سحری ہمکلام کب سے ہے

لاہور، مارچ ۵۹ء

جمے گی کیسے بساطِ یاراں، کہ شیشہ و جام بجھ گئے ہیں؟
سجے گی کیسے شبِ نگاراں، کہ دل سرِ شام بجھ گئے ہیں؟

وہ تیرگی ہے رہِ بتاں میں چراغِ رخ ہے، نہ شمعِ وعدہ
کرن کوئی آرزو کی لاؤ کہ سب در و بام بجھ گئے ہیں

بہت سنبھالا وفا کا پیماں، مگر وہ برسی ہے اب کے برکھا
ہر ایک اقرار مٹ گیا ہے، تمام پیغام بجھ گئے ہیں

قریب آ اے مہِ شبِ غم، نظر پہ کھلتا نہیں کچھ اس دم
کہ دل پہ کس کس کا نقش باقی ہے، کون سے نام بجھ گئے ہیں

بہار اب آ کے کیا کرے گی، کہ جن سے تھا جشنِ رنگ و نغمہ
وہ گل سرِ شاخ جل گئے ہیں، وہ دل تہِ دام بجھ گئے ہیں

بے دم ہوئے بیمار، دوا کیوں نہیں دیتے؟
تم اچھے مسیحا ہو، شفا کیوں نہیں دیتے؟

دردِ شبِ ہجراں کی جزا کیوں نہیں دیتے؟
خونِ دلِ وحشی کا صِلا کیوں نہیں دیتے؟

مٹ جائے گی مخلوق تو انصاف کرو گے؟
منصف ہو تو اب حشر اٹھا کیوں نہیں دیتے

ہاں، نکتہ ورو، لاؤ لب و دل کی گواہی
ہاں، نغمہ گرو، ساز صدا کیوں نہیں دیتے؟

پیمانِ جنوں ہاتھوں کو شرمائے گا کب تک؟
دل والو، گریباں کا پتا کیوں نہیں دیتے؟

بربادیِ دل جبر نہیں، فیضؔ، کسی کا
وہ دشمنِ جاں ہے تو بھلا کیوں نہیں دیتے؟

لاہور جیل
۳۱۔ دسمبر ۱۹۵۸ء

یہ جفائے غم کا چارہ، وہ نجاتِ دل کا عالم
ترا حسن دستِ عیسیٰ، تری یاد روئے مریم

دل و جاں فدائے راہے، کبھی آ کے دیکھ ہمدم
سرِ کوئے دل فگاراں شبِ آرزو کا عالم

تری دید سے سوا ہے ترے شوق میں بہاراں
وہ چمن جہاں گری ہے ترے گیسوؤں کی شبنم

یہ عجب قیامتیں ہیں تری رہگزر میں گزراں
نہ ہوا کہ مر مٹیں ہم، نہ ہوا کہ جی اٹھیں ہم

لو سنی گئی ہماری، یوں پھرے ہیں دن کہ پھر سے
وہی گوشۂ قفس ہے، وہی فصلِ گل کا ماتم

لاہور جیل۔ فروری ۱۹۵۹

ترے غم کو جاں کی تلاش تھی، ترے جاں نثار چلے گئے
تری رہ میں کرتے تھے سر طلب، سرِ رہگزار چلے گئے

تری کج ادائی سے ہار کے شبِ انتظار چلی گئی
مرے ضبطِ حال سے رُوٹھ کر مرے غمگسار چلے گئے

نہ سوالِ وصل، نہ عرضِ غم، نہ حکایتیں، نہ شکایتیں
ترے عہد میں دلِ زار کے سبھی اختیار چلے گئے

یہ ہمیں تھے جن کے لباس پر سرِ رہ سیاہی لکھی گئی
یہی داغ تھے جو سجا کے ہم سرِ بزمِ یار چلے گئے

نہ رہا جنونِ رُخِ وفا، یہ رسن، یہ دار کرو گے کیا
جنھیں جرمِ عشق پہ ناز تھا، وہ گناہ گار چلے گئے

جولائی ۱۹۵۹ء

کب ٹھہرے گا درد اے دل، کب رات بسر ہوگی
سنتے تھے وہ آئیں گے، سنتے تھے سحر ہوگی

کب جان لہو ہوگی، کب اشک گہر ہوگا
کِس دن تری شنوائی، اے دیدۂ تر ہوگی؟

کب مہکے گی فصلِ گل؟ کب بہکے گا مے خانہ؟
کب صبحِ سخن ہوگی؟ کب شامِ نظر ہوگی؟

واعظ ہے، نہ زاہد ہے، ناصح ہے، نہ قاتل ہے
اب شہر میں یاروں کی کِس طرح بسر ہوگی!

کب تک ابھی رہ دیکھیں، اے قامتِ جانانہ
کب حشر معیّن ہے، تجھ کو تو خبر ہوگی

آج یوں موج در موج غم تھم گیا، اس طرح غمزدوں کو قرار آگیا
جیسے خوشبوئے زلفِ بہار آگئی، جیسے پیغامِ دیدارِ یار آگیا

جس کی دید و طلب وہم سمجھے تھے ہم، رو برو پھر سرِ رہ گزار آگیا
صبحِ فردا کو پھر دل ترسنے لگا، عمرِ رفتہ، ترا اعتبار آگیا

رُت بدلنے لگی رنگِ دل دیکھنا، رنگِ گلشن سے اب حال کھلتا نہیں
زخم چھلکا کوئی یا کوئی گل کھلا، اشک اُمڈے کہ ابرِ بہار آگیا

خونِ عشّاق سے جام بھرنے لگے، دل سلگنے لگے، داغ جلنے لگے
محفلِ درد پھر رنگ پر آگئی، پھر شبِ آرزو پر نکھار آگیا

سرفروشی کے انداز بدلے گئے، دعوتِ قتل پر مقتلِ شہر میں
ڈال کر کوئی گردن میں طوق آگیا، لاد کر کوئی کاندھے پہ دار آگیا

فیضؔ کیا جانیے یار کس آس پر، منتظر ہیں کہ لائے گا کوئی خبر
مے کشوں پر ہوا محتسب مہرباں، دلفگاروں پہ قاتل کو پیار آگیا!

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

یک بیک شورشِ فغاں کی طرح
فصلِ گل آئی امتحاں کی طرح

صحنِ گلشن میں بہرِ مشتاقاں
ہر روش کھنچ گئی کماں کی طرح

پھر لہو سے ہر ایک کاسۂ داغ
پُر ہوا جامِ ارغواں کی طرح

یاد آیا جنونِ گم گشتہ
بے طلب قرضِ دوستاں کی طرح

جانے کس پر ہو مہرباں قاتل
بے سبب مرگِ ناگہاں کی طرح!

ہر صدا پر لگے ہیں کان یہاں
دل سنبھالے رہو زباں کی طرح

مئی ۱۹۶۲ء

نہ گنواؤ ناوکِ نیم کش، دل ریزہ ریزہ گنوا دیا
جو بچے ہیں سنگ سمیٹ لو تنِ داغ داغ لٹا دیا

مرے چارہ گر کو نوید ہو، صفِ دشمناں کو خبر کرو
جو وہ قرض رکھتے تھے جان پر، وہ حساب آج چکا دیا

کرو کج جبیں پہ سرِ کفن مرے قاتلوں کو گماں نہ ہو
کہ غرورِ عشق کا بانکپن پسِ مرگ ہم نے بھلا دیا!

اُدھر ایک حرف کہ کشتنی، یہاں لاکھ عذر تھا گفتنی
جو کہا تو سُن کے اُڑا دیا، جو لکھا تو پڑھ کے مِٹا دیا

جو رُکے تو کوہِ گراں تھے ہم، جو چلے تو جاں سے گزر گئے
رہِ یار، ہم نے قدم قدم تجھے یادگار بنا دیا

ہر سمت پریشاں تری آمد کے قرینے
دھوکے دیئے کیا کیا ہمیں بادِ سحری نے!

ہر منزلِ غربت پہ گماں ہوتا ہے گھر کا
بہلایا ہے ہر گام بہت دربدری نے

تھے بزم میں سب دودِ سرِ بزم سے شاداں
بیکار جلایا ہمیں روشن نظری نے

مے خانے میں عاجز ہوئے آزردہ دلی سے
مسجد کا نہ رکھا ہمیں آشفتہ سری نے

یہ جامۂ صد چاک بدل لینے میں کیا تھا
مہلت ہی نہ دی، فیضؔ، کبھی بخیہ گری نے!

لندن ۱۹۷۸

شرحِ فراق، مدحِ لبِ مشکبو کریں
غربت کدے میں کس سے تری گفتگو کریں؟

یار آشنا نہیں کوئی، ٹکرائیں کس سے جام؟
کس دلربا کے نام پہ خالی سبو کریں؟

سینے پہ ہاتھ ہے نہ نظر کو تلاشِ بام
دل ساتھ دے تو آج غمِ آرزو کریں

کب تک سنے گی رات، کہاں تک سنائیں ہم
شکوے گلے سب آج ترے رو برو کریں

ہمدم، حدیثِ کوئے ملامت سنائیو
دل کو لہو کریں کہ گریباں رفو کریں؟

آشفتہ سر ہیں، محتسبو، مُنہ نہ آئیو
سر بیچ دیں تو فکرِ دل و جاں عُدو کریں!

تر دامنی پہ شیخ، ہماری نہ جائیو
دامن نچوڑ دیں تو فرشتے وضو کریں"

لندن ۶۳ء

یوں سجا چاند کہ جھلکا ترے انداز کا رنگ
یوں فضا مہکی کہ بدلا مرے ہمراز کا رنگ

سایۂ چشم میں حیراں رخِ روشن کا جمال
سُرخیِ لب میں پریشاں تری آواز کا رنگ

بے پیے ہوں کہ اگر لُطف کرو آخرِ شب
شیشۂ مے میں ڈھلے صبح کے آغاز کا رنگ

چنگ و نے رنگ پہ تھے اپنے لہو کے دم سے
دل نے لَے بدلی تو مدھم ہوا ہر ساز کا رنگ

اک سخن اور، کہ پھر رنگِ تکلم تیرا
حرفِ سادہ کو عنایت کرے اعجاز کا رنگ

اپریل ۱۹۶۵ء

کس حرف پہ تو نے گوشۂ لب اے جانِ جہاں غماز کیا
اعلانِ جنوں دل والوں نے اب کے بہ ہزار انداز کیا

سو پیکاں تھے پیوستِ گلو، جب چھیڑی شوق کی لَے ہم نے
سو تیر ترازو تھے دل میں، جب ہم نے رقص آغاز کیا

بے حرص و ہوا، بے خوف و خطر، اس ہاتھ پہ سر، اس کف پہ جگر
یوں کوئے صنم میں وقتِ سفر نظارۂ بامِ ناز کیا

جس خاک میں مل کر خاک ہوئے، وہ سرمۂ چشمِ خلق بنی
جس خار پہ ہم نے خوں چھڑکا، ہم رنگِ گلِ طناز کیا

لو وصل کی ساعت آ پہنچی، پھر حکمِ حضوری پر ہم نے
آنکھوں کے دریچے بند کیے، اور سینے کا در باز کیا

ستمبر ۱۹۶۵ء

کیے آرزو سے پیماں جو مآل تک نہ پہنچے
شبِ و روزِ آشنائی مہ و سال تک نہ پہنچے

وہ نظر بہم نہ پہنچی کہ محیطِ حسن کرتے
تری دید کے وسیلے خد و خال تک نہ پہنچے

وہی چشمۂ بقا تھا جسے سب سراب سمجھے
وہی خواب معتبر تھے جو خیال تک نہ پہنچے

ترا لطف وجہِ تسکیں نہ قرارِ شرحِ غم سے
کہ ہیں دل میں وہ گلے بھی جو ملال تک نہ پہنچے

کوئی یارِ جاں سے گزرا، کوئی ہوش سے نہ گزرا
یہ ندیمِ یک دو ساغر مرے حال تک نہ پہنچے

چلو فیضؔ، دل جلائیں، کریں پھر سے عرضِ جاناں
وہ سخن جو لب تک آئے پہ سوال تک نہ پہنچے

۱۹۶۶ء

نہ کسی پہ زخم عیاں کوئی ، نہ کسی کو فکر رفو کی ہے
نہ کرم ہے ہم پہ حبیب کا، نہ نگاہ ہم پہ عدو کی ہے

صفِ زاہداں ہے تو بے یقیں، صفِ میکشاں ہے تو بے طلب
نہ وہ صبح وِرد و وضو کی ہے، نہ وہ شام جام و سبو کی ہے

نہ یہ غم نیا، نہ ستم نیا، کہ تری جفا کا گلہ کریں
یہ نظر تھی پہلے بھی مضطرب، یہ کسک تو دل میں کبھو کی ہے

کفِ باغباں پہ بہارِ گُل کا ہے قرض پہلے سے بیشتر
کہ ہر ایک پھول کے پیرہن میں نمود میرے لہو کی ہے

نہیں خوفِ روزِ سیہ ہمیں، کہ ہے فیضؔ ظرفِ نگاہ میں
ابھی گوشہ گیر وہ اک کرن، جو لگن اُس آئنہ رُو کی ہے

۱۹۶۸ء

چاند نکلے کسی جانب تری زیبائی کا!
رنگ بدلے کسی صورت شبِ تنہائی کا!

دولتِ لب سے پھر اے خسروِ شیریں دہناں!
آج ارزاں ہو کوئی حرف شناسائی کا

گرمیِ رشک سے ہر انجمنِ گل بدناں
تذکرہ چھیڑے تری پیرہن آرائی کا

صحنِ گلشن میں کبھی اے شہِ شمشاد قداں!
پھر نظر آئے سلیقہ تری رعنائی کا

ایک بار اور مسیحائے دلِ دل زدگاں!
کوئی وعدہ، کوئی اقرار مسیحائی کا

دیدہ و دل کو سنبھالو، کہ سرِ شامِ فراق
ساز و سامان بہم پہنچا ہے رُسوائی کا

اگست ۱۹۶۸ء

کب تک دل کی خیر منائیں، کب تک رہ دکھلاؤ گے؟
کب تک چین کی مہلت دو گے، کب تک یاد نہ آؤ گے؟

بیتا دید اُمید کا موسم، خاک اُڑتی ہے آنکھوں میں
کب بھیجو گے درد کا بادل؟ کب برکھا برساؤ گے؟

عہدِ وفا یا ترکِ محبت، جو چاہو، سو آپ کرو
اپنے بس کی بات ہی کیا ہے، ہم سے کیا منواؤ گے؟

کس نے وصل کا سُورج دیکھا، کس پر ہجر کی رات ڈھلی؟
گیسوؤں والے کون تھے کیا تھے ان کو کیا جتلاؤ گے؟

فیضؔ، دلوں کے بھاگ میں ہے گھر بھرنا بھی لُٹ جانا بھی
تم اُس حسن کے لطف و کرم پر کتنے دن اِتراؤ گے؟

اکتوبر ۱۹۶۸ء

شرحِ بے دردیِ حالات نہ ہونے پائی
اب کے بھی دل کی مدارات نہ ہونے پائی

پھر وہی وعدہ جو اقرار نہ بننے پایا
پھر وہی بات جو اثبات نہ ہونے پائی

پھر وہ پروانے، جنھیں اِذنِ شہادت نہ ملا
پھر وہ شمعیں کہ جنھیں رات نہ ہونے پائی

پھر وہی جاں بلبی لذّتِ مے سے پہلے
پھر وہ محفل جو خرابات نہ ہونے پائی

پھر دمِ دید رہے دیدہ و دل دید طلب
پھر شبِ وصل ملاقات نہ ہونے پائی

پھر وہاں بابِ اثر جانیے کب بند ہوا
پھر یہاں ختم مُناجات نہ ہونے پائی

فیضؔ، سر پر جو ہر اک روز قیامت گزری
ایک بھی روزِ مکافات نہ ہونے پائی

۲۳- مارچ ۱۹۷۱ء

ہم سادہ ہی ایسے تھے، کی یوں ہی پذیرائی
جس بار خزاں آئی، سمجھے کہ بہار آئی!

آشوبِ نظر سے کی ہم نے چمن آرائی
جو شے بھی نظر آئی، گُل رنگ نظر آئی

اُمیدِ عنایت میں رنجیدہ رہے دونوں
تو اور تری محفل، میں اور مری تنہائی!

یک جاں نہ ہو سکیے، انجان نہ بن سکیے
یوں ٹوٹ گئی دل میں شمشیرِ شناسائی
اس تن کی طرف دیکھو جو قتل گہِ دل ہے
کیا رکھا ہے مقتل میں اے چشمِ تماشائی

مئی ۱۹۷۱ء

ہم نے سب شعر میں سنوارے تھے
ہم سے جتنے سخن تمہارے تھے

رنگ و خوشبو کے، حسن و خوبی کے
تم سے تھے جتنے استعارے تھے

تیرے قول و قرار سے پہلے
اپنے کچھ اور بھی سہارے تھے

جب وہ لعل و گہر حساب کیے
جو ترے غم پہ دل نے وارے تھے

ق

میرے دامن میں آ گرے سارے
جتنے طشتِ فلک میں تارے تھے

عمرِ جاوید کی دعا کرتے
فیضؔ، اتنے وہ کب ہمارے تھے!

۱۹۷۲ء

نہ اب رقیب، نہ ناصح، نہ غم گسار کوئی
تم آشنا تھے تو تھیں آشنائیاں کیا کیا!

جدا تھے ہم تو میسر تھیں قربتیں کتنی!
بہم ہوئے تو پڑی ہیں جدائیاں کیا کیا!

پہنچ کے در پہ ترے کتنے معتبر ٹھہرے
اگرچہ رہ میں ہوئیں جگ ہنسائیاں کیا کیا!

ہم ایسے سادہ دلوں کی نیازمندی سے
بتوں نے کی ہیں جہاں میں خدائیاں کیا کیا!

ستم پہ خوش، کبھی لطف و کرم سے رنجیدہ
سکھائیں تم نے ہمیں کج ادائیاں کیا کیا!

۱۹۷۳ء

یہ موسمِ گُل گرچہ طرب خیز بہت ہے
احوالِ گُل و لالہ غم انگیز بہت ہے

خوش دعوتِ یاراں بھی ہے، یلغارِ عدو بھی
کیا کیجیے دل کا جو کم آمیز بہت ہے!

یوں پیرِ مغاں شیخِ حرم سے ہوئے یک جاں
میخانے میں کم ظرفیِ پرہیز بہت ہے!

اک گردنِ مخلوق جو ہر حال میں خم ہے
اک بازوئے قاتل ہے کہ خوں ریز بہت ہے

کیوں مشعلِ دل، فیضؔ، چھپاؤ تہِ داماں!
بجھ جائے گی یوں بھی، کہ ہوا تیز بہت ہے

۱۹۶۵ء

ہمیں سے اپنی نوا ہم کلام ہوتی رہی
یہ تیغ اپنے لہو میں نیام ہوتی رہی

مقابلِ صفِ اعدا جسے کیا آغاز
وہ جنگ اپنے ہی دل میں تمام ہوتی رہی

کوئی مسیحا نہ ایفائے عہد کو پہنچا
بہت تلاش پسِ قتلِ عام ہوتی رہی

یہ برہمن کا کرم، وہ عطائے شیخِ حرم
کبھی حیات کبھی مے حرام ہوتی رہی!

جو کچھ بھی بن نہ پڑا، فیضؔ لُٹ کے یاروں سے
تو رہزنوں سے دعا و سلام ہوتی رہی!

تمہیں پکارا ہے بے ارادہ
جو دل دُکھا ہے بہت زیادہ

ندیم ہو تیرا حرفِ شیریں
تو رنگ پر آئے رنگِ بادہ

عطا کرو اک ادائے دیریں
تو اشک سے تر کریں لبادہ

نہ جانے کس دن سے منتظر ہے
دلِ سرِ رہگزر فتادہ

کہ ایک دن پھر نظر میں آئے
وہ بامِ روشن وہ در کشادہ

وہ آئے پرسش کو پھر سجائے
قبائے رنگیں، ادائے سادہ

حسرتِ دید میں گزراں ہیں زمانے کب سے!
دشتِ اُمید میں گرداں ہیں دوانے کب سے!

دیر سے آنکھ پہ اُترا نہیں اشکوں کا عذاب
اپنے ذمّے ہے ترا قرض نہ جانے کب سے!

کس طرح پاک ہو بے آرزو لمحوں کا حساب
درد آیا نہیں دربار سجانے کب سے!

سُر کرو ساز، کہ چھیڑیں کوئی دل سوز غزل
"ڈھونڈتا ہے دلِ شوریدہ بہانے کب سے"!

پُر کرو جام کہ شاید ہو اسی لحظہ رواں
روک رکھا ہے جو اک تیر قضا نے کب سے!

فیضؔ، پھر کب کسی مقتل میں کریں گے آباد؟
لب پہ ویراں ہیں شہیدوں کے فسانے کب سے!

یہ کس خلش نے پھر اس دل میں آشیانہ کیا
پھر آج کس نے سخن ہم سے غائبانہ کیا

غمِ جہاں ہو، رُخِ یار ہو، کہ دستِ عدو
سلوک جس سے کیا ہم نے عاشقانہ کیا

تھے خاکِ راہ بھی ہم لوگ، قہرِ طوفاں بھی
سہا تو کیا نہ سہا، اور کیا تو کیا نہ کیا

خوشا، کہ آج ہر اک مدعی کے لب پہ ہے
وہ راز جس نے ہمیں راندۂ زمانہ کیا

وہ حیلہ گر جو وفا جُو بھی ہے، جفا خُو بھی
کیا بھی، فیضؔ، تو کس بُت سے دوستانہ کیا

۱۹۸۲ء

کس شہر نہ شُہرہ ہوا نادانیِ دل کا!
کس پر نہ کھُلا رازِ پریشانیِ دل کا!

آؤ کریں محفل پہ زرِ زخم نمایاں
چرچا ہے بہت بے سروسامانیِ دل کا

دیکھ آئیں، چلو، کوئے نگاراں کا خرابہ
شاید کوئی محرم ملے ویرانیِ دل کا

پوچھو تو، اِدھر تیر فگن کون ہے یارو!
سونپا تھا جسے کام نگہبانیِ دل کا

دیکھو تو، کدھر آج رخِ بادِ صبا ہے
کس رہ سے پیام آیا ہے زندانیِ دل کا

اُترے تھے کبھی فیضؔ، وہ آئینۂ دل میں
عالم ہے وہی آج بھی حیرانیِ دل کا

حیراں ہے جبیں آج کدھر سجدہ روا ہے
سر پر ہیں خداوند، سرِ عرش خدا ہے

کب تک اسے سینچو گے تمنائے ثمر میں؟
یہ صبر کا پودا تو نہ پھولا نہ پھلا ہے

ملتا ہے خراج اس کو تری نانِ جویں سے
ہر بادشہِ وقت ترے در کا گدا ہے

ہر ایک عقوبت سے ہے تلخی میں سوا تر
وہ رنج جو ناکردہ گناہوں کی سزا ہے

احسان لیے کتنے مسیحا نفسوں کے
کیا کیجیے دل کا نہ جلا ہے نہ بجھا ہے!

اکتوبر ۷۷ء

وہ بُتوں نے ڈالے ہیں وسوسے کہ دلوں سے خوفِ خدا گیا
وہ پڑی ہیں روز قیامتیں، کہ خیالِ روزِ جزا گیا

جو نفس تھا خارِ گلو بنا، جو اُٹھے تو ہاتھ لہُو ہوئے
وہ نشاطِ آہِ سحر گئی، وہ وقارِ دستِ دُعا گیا

جو طلب پہ عہدِ وفا کیا، تو وہ قدرِ رسمِ وفا گئی
سرِ عام جب ہُوئے مدعی، تو ثوابِ صدق و صفا گیا

نہ وہ رنگ فصلِ بہار کا، نہ روِش وہ ابرِ بہار کی
جس ادا سے یار تھے آشنا وہ مزاجِ بادِ صبا گیا

ابھی بادبان کو تہ رکھو ابھی مضطرب ہے رخِ ہوا
کسی راستے میں ہے منتظر وہ سکوں جو آکے چلا گیا

دو غزلیں مخدوم کی یاد میں

"آپ کی یاد آتی رہی رات بھر"
چاندنی دِل دُکھاتی رہی رات بھر

گاہ جلتی ہوئی گاہ بُجھتی ہوئی
شمعِ غم جھلملاتی رہی رات بھر

کوئی خوشبو بدلتی رہی پیرہن
کوئی تصویر گاتی رہی رات بھر

پھر صبا سایۂ شاخِ گل کے تلے
کوئی قصہ سناتی رہی رات بھر

جو نہ آیا اسے کوئی زنجیرِ در
ہر صدا پر بلاتی رہی رات بھر

ایک امید سے دل بہلتا رہا
اک تمنا ستاتی رہی رات بھر

ماسکو ستمبر ۱۹۷۸

اسی انداز سے چل بادِ صبا آخرِ شب

"یاد کا پھر کوئی دروازہ کھلا آخرِ شب"
دل میں بکھری کوئی خوشبوئے قبا آخرِ شب

صبح پھوٹی تو وہ پہلو سے اُٹھا آخرِ شب
وہ جو اک عمر سے آیا نہ گیا آخرِ شب

چاند سے ماند ستاروں نے کہا آخرِ شب
کون کرتا ہے وفا عہدِ وفا آخرِ شب

لمسِ جانانہ لیے مستیِ پیمانہ لیے
حمدِ باری کو اُٹھے دستِ دعا آخرِ شب

گھر جو ویراں تھا سرِ شام، وہ کیسے کیسے
فرقتِ یار نے آباد کیا آخرِ شب!

جس ادا سے کوئی آیا تھا کبھی اوّلِ صبح
اُسی انداز سے چل بادِ صبا آخرِ شب"

ماسکو۔ اکتوبر ۷۸ء

ایک دکنی غزل

کچھ پہلے ان آنکھوں آگے کیا کیا نہ نظارا گزرے تھا
کیا روشن ہو جاتی تھی گلی جب یار ہمارا گزرے تھا

تھے کتنے اچھے لوگ کہ جن کو اپنے غم سے فرصت تھی
سب پوچھیں تھے احوال جو کوئی درد کا مارا گزرے تھا

اب کے تو خزاں ایسی ٹھہری وہ سارے زمانے بھول گئے
جب موسمِ گُل ہر پھیرے میں آ آ کے دوبارا گزرے تھا

تھی یاروں کی بہتات تو ہم اغیار سے بھی بیزار نہ تھے
جب مل بیٹھے تو دشمن کا بھی ساتھ گوارا گزرے تھا

اب تو ہاتھ سجھائی نہ دیوے، لیکن اب سے پہلے تو
آنکھ اُٹھتے ہی ایک نظر میں عالم سارا گزرے تھا

ماسکو۔ اکتوبر ۱۹۷۸ء

سہل یوں راہِ زندگی کی ہے
ہر قدم ہم نے عاشقی کی ہے

ہم نے دل میں سجا لیے گُلشن
جب بہاروں نے بے رُخی کی ہے

زہر سے دھو لیے ہیں ہونٹ اپنے
لطفِ ساقی نے جب کمی کی ہے

تیرے کوچے میں بادشاہی کی
جب سے نکلے گداگری کی ہے

بس وہی سُرخرو ہوا جس نے
بحرِ خوں میں شناوری کی ہے

"جو گزرتے تھے داغؔ پر صدمے
اب وہی کیفیت سبھی کی ہے"

لندن ۷۹ء

سبھی کچھ ہے تیرا دیا ہوا، سبھی راحتیں، سبھی کلفتیں
کبھی صحبتیں، کبھی فرقتیں، کبھی دوریاں، کبھی قربتیں

یہ سخن جو ہم نے رقم کیے، یہ ہیں سب ورق تری یاد کے
کوئی لمحہ صبحِ وصال کا، کئی شامِ ہجر کی مدتیں

جو تمہاری مان لیں ناصحا، تو رہے گا دامنِ دل میں کیا
نہ کسی عدو کی عداوتیں، نہ کسی صنم کی مروتیں

چلو، آؤ تم کو دکھائیں ہم جو بچا ہے مقتلِ شہر میں
یہ مزار اہلِ صفا کے ہیں، یہ ہیں اہلِ صدق کی تربتیں

مری جان، آج کا غم نہ کر، کہ نہ جانے کاتبِ وقت نے
کسی اپنے کل میں بھی بھول کر کہیں لکھ رکھی ہوں مسرتیں

بیروت ۷۹ء

اب کے برس دستورِ ستم میں کیا کیا باب ایزاد ہوئے
جو قاتل تھے مقتول ہوئے، جو صید تھے اب صیاد ہوئے!

پہلے بھی خزاں میں باغ اجڑے پر یوں نہیں جیسے اب کے برس
سارے بوٹے پتہ پتہ روش روش برباد ہوئے

پہلے بھی طوافِ شمعِ وفا تھی رسم محبت والوں کی
ہم تم سے پہلے بھی یہاں منصور ہوئے فرہاد ہوئے

اک گُل کے مُرجھانے پر کیا گلشن میں کہرام مچا!
اک چہرہ کُمھلا جانے سے کتنے دل ناشاد ہوئے!

فیضؔ نہ ہم یوسف، نہ کوئی یعقوب جو ہم کو یاد کرے
اپنا کیا کنعاں میں رہے یا مصر میں جا آباد ہوئے!

جیسے ہم بزم ہیں پھر یارِ طرحدار سے ہم
رات ملتے رہے اپنے در و دیوار سے ہم

سرخوشی میں یونہی سرمست و غزل خواں گزرے
کوئے قاتل سے کبھی کوچۂ دلدار سے ہم

کبھی منزل، کبھی رستے نے ہمیں ساتھ دیا
ہر قدم اُلجھے رہے قافلہ سالار سے ہم

ہم سے بے بہرہ ہوئی اب جرسِ گُل کی صدا
ورنہ واقف تھے ہر اک رنگ کی جھنکار سے ہم

اب وہاں کتنی مرصع ہے وہ سورج کی کرن
کل جہاں قتل ہوئے تھے اسی تلوار سے ہم!

فیضؔ، جب چاہا، جو کچھ چاہا سدا مانگ لیے
ہاتھ پھیلا کے دلِ بے زر و دینار سے ہم

ستم سکھلائے گا رسمِ وفا، ایسے نہیں ہوتا
صنم دکھلائیں گے راہِ خدا، ایسے نہیں ہوتا

گنو سب حسرتیں جو خوں ہوئی ہیں تن کے مقتل میں
مرے قاتل حسابِ خوں بہا ایسے نہیں ہوتا

جہانِ دل میں کام آتی ہیں تدبیریں نہ تعزیریں
یہاں پیمانِ تسلیم و رضا ایسے نہیں ہوتا

ہر اک شب ہر گھڑی گزرے قیامت یوں تو ہوتا ہے
مگر ہر صبح ہو روزِ جزا، ایسے نہیں ہوتا

رواں ہے نبضِ دوراں، گردشوں میں آسماں سارے
جو تم کہتے ہو سب کچھ ہو چکا ایسے نہیں ہوتا

ہم مسافر یونہی مصروفِ سفر جائیں گے
بے نشاں ہو گئے جب شہر تو گھر جائیں گے

کس قدر ہو گا یہاں مہر و وفا کا ماتم
ہم تری یاد سے جس روز اتر جائیں گے

جوہری بند کیے جاتے ہیں بازارِ سخن
ہم کسے بیچنے الماس و گہر جائیں گے

نعمتِ زیست کا یہ قرض چکے گا کیسے
لاکھ گھبرا کے یہ کہتے رہیں مر جائیں گے

شاید اپنا بھی کوئی بیت حُدی خواں بن کر
ساتھ جائے گا مرے یار جدھر جائیں گے

فیضؔ، آتے ہیں رہِ عشق میں جو سخت مقام
آنے والوں سے کہو، ہم تو گذر جائیں گے

اب کہاں رسم گھر لٹانے کی!
برکتیں تھیں شراب خانے کی!

کون ہے جس سے گفتگو کیجے
جان دینے کی، دل لگانے کی؟

بات چھیڑی تو اٹھ گئی محفل
ان سے جو بات تھی بتانے کی

ساز اٹھایا تو تھم گیا غمِ دل
رہ گئی آرزو سنانے کی

چاند پھر آج بھی نہیں نکلا
کتنی حسرت تھی ان کے آنے کی!

کس قدر دل نے اُن کو یاد کیا
جب بھی تدبیر کی بُھلانے کی!

بیروت اگست ۱۹۸۰ء

دربار میں اب سطوتِ شاہی کی علامت
درباں کا عصا ہے کہ مصنّف کا قلم ہے

آوارہ ہے پھر کوہِ ندا پر جو بشارت
تمہیدِ مسرت ہے کہ طولِ شبِ غم ہے

جس دھجّی کو گلیوں میں لیے پھرتے ہیں طفلاں
یہ میرا گریباں ہے کہ لشکر کا علَم ہے

جس عکس سے ہے شہر کی دیوار درخشاں
یہ خونِ شہیداں ہے کہ زرخانۂ جم ہے

حلقہ کیے بیٹھے رہو اک شمع کو یارو
کچھ روشنی باقی تو ہے ہر چند کہ کم ہے

نہیں نگاہ میں منزل تو جستجو ہی سہی
نہیں وصال میسّر تو آرزو ہی سہی

نہ تن میں خون فراہم نہ اشک آنکھوں میں
نمازِ شوق تو واجب ہے بے وضو ہی سہی

یہی بہت ہے کہ سالم ہے دل کا پیراہن
یہ چاک چاک گریبان بے رفو ہی سہی

کسی طرح تو جمے بزم میکدے والو
نہیں جو بادہ و ساغر تو ہاؤ ہُو ہی سہی

گر انتظار کٹھن ہے تو جب تلک اے دل
کسی کے وعدۂ فردا سے گفتگو ہی سہی

دیارِ غیر میں محرم اگر نہیں کوئی
تو فیضؔ ذکرِ وطن اپنے رُو برُو ہی سہی

غم بہ دل، شکر بہ لب، مست و غزل خواں چلیے
جب تلک ساتھ ترے عمرِ گریزاں چلیے

رحمتِ حق سے جو اِس سمت کبھی راہ ملے
سوئے جنت بھی براہِ رہِ جاناں چلیے

نذر مانگے جو گلستاں سے خداوندِ جہاں
ساغر و خم میں لیے خونِ بہاراں چلیے

جب ستانے لگے بے رنگیِ دیوارِ جہاں
نقش کرنے کوئی تصویرِ حسیناں چلیے

کچھ بھی ہو آئینۂ دل کو مُصفّا رکھیے
جو بھی گزرے، مثلِ خسروِ دوراں چلیے

امتحاں جب بھی ہو منظور جگر داروں کا

محفلِ یار میں ہمراہِ رقیباں چلئے

بساطِ رقص پہ صد شرق و غرب سے سرِ شام
دمک رہا ہے تری دوستی کا ماہِ تمام

چھلک رہی ہے ترے حُسنِ مہرباں کی شراب
بھرا ہوا ہے لبالب ہر اک نگاہ کا جام

گلے میں تنگ ترے حرفِ لطف کی باہیں
پسِ خیال کہیں ساعتِ سفر کا پیام

ابھی سے یاد میں ڈھلنے لگی ہے صحبتِ شب
ہر ایک رُوئے حسیں ہو چلا ہے بیش حسیں

ملے کچھ ایسے، جدا یوں ہوئے کہ فیضؔ اب کے
جو دل پہ نقش بنے گا وہ گُل ہے داغ نہیں

ہانگ چاؤ (چین) جولائی ۱۹۵۶ء

نذرِ حسرت موہانی

مر جائیں گے ظالم کہ حمایت نہ کریں گے
احرار کبھی ترکِ روایت نہ کریں گے

کیا کچھ نہ ملا ہے جو کبھی تجھ سے ملے تھے
اب تیرے نہ ملنے کی شکایت نہ کریں گے

شب بیت گئی ہے تو گزر جائے گا دن بھی
ہر لحظہ جو گزری وہ حکایت نہ کریں گے

یہ فقرِ دلِ زار کا عوضانہ بہت ہے
شاہی نہیں مانگیں گے ولایت نہ کریں گے

ہم شیخ نہ لیڈر نہ مصاحب نہ صحافی
جو خود نہیں کرتے وہ ہدایت نہ کریں گے

نظمیں

دشتِ خزاں میں جس دم پھیلے
رخصتِ فصلِ گل کی خوشبو
صبح کے چشمے پر جب پہنچے
پیاس کا مارا رات کا آہو
یادوں کے خاشاک میں جاگے
شوق کے انگاروں کا جادو
شاید پل بھر کو لوٹ آئے
عمرِ گزشتہ، وصلِ من و تو

بیروت مئی ۱۹۸۲ء

خدا وہ وقت نہ لائے

خدا وہ وقت نہ لائے کہ سوگوار ہو تو
سکوں کی نیند تجھے بھی حرام ہو جائے
تری مسرتِ پیہم تمام ہو جائے
تری حیات تجھے تلخ جام ہو جائے
غموں سے آئینۂ دل گداز ہو تیرا
ہجومِ یاس سے بیتاب ہو کے رہ جائے
وفورِ درد سے سیماب ہو کے رہ جائے
ترا شباب فقط خواب ہو کے رہ جائے
غرورِ حسن سراپا نیاز ہو تیرا

طویل راتوں میں تو بھی قرار کو ترسے

تری نگاہ کسی غمگسار کو ترسے

خزاں رسیدہ تمنّا بہار کو ترسے

کوئی جبیں نہ ترے سنگِ آستاں پہ جھکے

کہ جنسِ عجز و عقیدت سے تجھ کو شاد کرے

فریبِ وعدۂ فردا پہ اعتماد کرے

خدا وہ وقت نہ لائے کہ تجھ کو یاد آئے

وہ دل کہ تیرے لئے بیقرار اب بھی ہے

وہ آنکھ جس کو ترا انتظار اب بھی ہے

انہماکِ کار

پندار کے خوگر کو
ناکام بھی دیکھو گے
آغاز سے واقف ہو
انجام بھی دیکھو گے

رنگینیِ دنیا سے
مایوس سا ہو جانا
دکھتا ہوا دِل لے کر
تنہائی میں کھو جانا

ترسی ہوئی نظروں کو
حسرت سے جھکا لینا
فریاد کے ٹکڑوں کو
آہوں میں چھپا لینا
راتوں کی خموشی میں
چھپ کر کبھی رو لینا
مجبور جوانی کے
ملبوس کو دھو لینا
جذبات کی وسعت کو
سجدوں سے بسا لینا
بھولی ہوئی یادوں کو
سینے سے لگا لینا

انجام

ہیں لبریز آہوں سے ٹھنڈی ہوائیں
اُداسی میں ڈوبی ہوئی ہیں گھٹائیں

محبت کی دُنیا میں شام آچکی ہے
سیہ پوش ہیں زندگی کی فضائیں

مچلتی ہیں سینے میں لاکھ آرزوئیں
تڑپتی ہیں آنکھوں میں لاکھ التجائیں

تغافل کے آغوش میں سو رہے ہیں
تمہارے ستم اور میری وفائیں

مگر پھر بھی اے میرے معصوم قاتل
تمہیں پیار کرتی ہیں میری دعائیں

سرودِ شبانہ

گُم ہے اک کیف میں فضائے حیات
خامشی سجدۂ نیاز میں ہے
حُسنِ معصوم خوابِ ناز میں ہے

اے کہ تو رنگ و بُو کا طوفاں ہے
اے کہ تو جلوہ گر بہار میں ہے
زندگی تیرے اختیار میں ہے

پھول لاکھوں برس نہیں رہتے
دو گھڑی اور ہے بہارِ شباب

آ کہ کچھ دل کی سُن سُنائیں ہم
آ محبّت کے گیت گا لیں ہم

میری تنہائیوں پہ شام رہے
حسرتِ دید نا تمام رہے

دل میں بیتاب ہے صدائے حیات
آنکھ گوہر نثار کرتی ہے
آسماں پر اُداس ہیں تارے
چاندنی اِنتظار کرتی ہے

آ کہ تھوڑا سا پیار کر لیں ہم
زندگی زر نگار کر لیں ہم

آخری خط

وہ وقت، مری جان، بہت دور نہیں ہے
جب درد سے رُک جائیں گی سب زیست کی راہیں
اور حد سے گزر جائے گا اندوہِ نہانی
تھک جائیں گی ترسی ہوئی ناکام نگاہیں
چھن جائیں گے مجھ سے مرے آنسو، مری آہیں
چھن جائے گی مجھ سے مری بے کار جوانی
شاید مری الفت کو بہت یاد کرو گی
اپنے دلِ معصوم کو ناشاد کرو گی
آؤ گی مری گور پہ تم اشک بہانے
نوخیز بہاروں کے حسیں پھول چڑھانے

شاید مری تربت کو بھی ٹھکرا کے چلو گی
شاید مری بے سود وفاؤں پہ ہنسو گی
اس وضعِ کرم کا بھی تمہیں پاس نہ ہو گا
لیکن دلِ ناکام کا احساس نہ ہو گا
القصہ مآلِ غمِ الفت پہ ہنسو تم
یا اشک بہاتی رہو، فریاد کرو تم
ماضی پہ ندامت ہو تمہیں یا کہ مسرت
خاموش پڑا سوئے گا واماندۂ الفت

حسینہ خیال سے

مجھے دے دے

رسیلے ہونٹ، معصومانہ پیشانی، حسیں آنکھیں
کہ میں اک بار پھر رنگینیوں میں غرق ہو جاؤں
مری ہستی کو تیری اک نظر آغوش میں لے لے
ہمیشہ کے لیے اس دام میں محفوظ ہو جاؤں
ضیاءِ حسن سے ظلماتِ دنیا میں نہ پھر آؤں

گذشتہ حسرتوں کے داغ میرے دل سے دھل جائیں
میں آنے والے غم کی فکر سے آزاد ہو جاؤں
مرے ماضی و مستقبل سراسر محو ہو جائیں
مجھے وہ اک نظر، اک جاودانی سی نظر دے دے

(براؤننگ)

مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو

مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو

ابھی تک دل میں تیرے عشق کی قندیل روشن ہے
ترے جلووں سے بزمِ زندگی جنّت بداماں ہے
مری روح اب بھی تنہائی میں تجھ کو یاد کرتی ہے
ہر اک تارِ نفس میں آرزو بیدار ہے اب بھی
ہر اک بے رنگ ساعت منتظر ہے تیری آمد کی
نگاہیں بچھ رہی ہیں راستہ زرکار ہے اب بھی

مگر جانِ حزیں صدمے سہے گی آخرش کب تک
تری بے مہریوں پہ جان دے گی آخرش کب تک

تری آواز میں سوئی ہوئی شیرینیاں آخر
مرے دِل کی فسردہ خلوتوں میں جا نہ پائیں گی
یہ اشکوں کی فراوانی سے دھندلائی ہوئی آنکھیں
تری رعنائیوں کی تمکنت کو بھول جائیں گی

پکاریں گے تجھے تو لب کوئی لذّت نہ پائیں گے
گُلو میں تیری اُلفت کے ترانے سُوکھ جائیں گے

مبادا یاد ہائے عہدِ ماضی محو ہو جائیں
یہ پارینہ فسانے موجہائے غم میں کھو جائیں
مرے دِل کی تہوں سے تیری صورت دُھل کے بہ جائے
حریمِ عشق کی شمعِ درخشاں بُجھ کے رہ جائے

مبادا اجنبی دنیا کی ظلمت گھیرے تجھ کو
مری جاں اب بھی اپنا حسن واپس پھیر دے مجھ کو

بعد از وقت

دل کو احساس سے دوچار نہ کر دینا تھا
سازِ خوابیدہ کو بیدار نہ کر دینا تھا

اپنے معصوم تبسم کی فراوانی کو
وسعتِ دید پہ گلبار نہ کر دینا تھا

شوقِ مجبور کو بس ایک جھلک دکھلا کر
واقفِ لذّتِ تکرار نہ کر دینا تھا

چشمِ مُشتاق کی خاموش تمناؤں کو
یک بیک مائلِ گفتار نہ کر دینا تھا

جلوۂ حُسن کو مستور ہی رہنے دیتے
حسرتِ دل کو گنہگار نہ کر دیتا تھا

سرودِ شبانہ

نیم شب، چاند، خود فراموشی
محفلِ ہست و بود ویراں ہے
پیکرِ التجا ہے خاموشی
بزمِ انجم فسردہ ساماں ہے
آبشارِ سکوت جاری ہے
چار سو بے خودی سی طاری ہے
زندگی جزوِ خواب ہے گویا
ساری دنیا سراب ہے گویا
سو رہی ہے گھنے درختوں پر
چاندنی کی تھکی ہوئی آواز

کہکشاں نیم وا نگاہوں سے

کہہ رہی ہے حدیثِ شوقِ نیاز

سازِ دل کے خموش تاروں سے

چھن رہا ہے خمارِ کیف آگیں

آرزو، خواب، تیرا روئے حسیں

اِنتظار

گزر رہے ہیں شب و روز تم نہیں آتیں

ریاضِ زیست ہے آزردۂ بہار ابھی
مرے خیال کی دنیا ہے سوگوار ابھی

جو حسرتیں ترے غم کی کفیل ہیں پیاری
ابھی تلک مری تنہائیوں میں بستی ہیں
طویل راتیں ابھی تک طویل ہیں پیاری
اُداس آنکھیں تری دید کو ترستی ہیں

بہارِ حسن، یہ پابندیِ جفا کب تک
یہ آزمائشِ صبرِ گریز پا کب تک

قسم تمہاری بہت غم اٹھا چکا ہوں میں
غلط تھا دعویِ صبر و شکیب، آ جاؤ
قرارِ خاطرِ بیتاب تھک گیا ہوں میں

تہِ نجُوم

تہِ نجُوم، کہیں چاندنی کے دامن میں
ہجومِ شوق سے اِک دل ہے بیقرار ابھی
خمارِ خواب سے لبریز احمریں آنکھیں
سفید رُخ پہ پریشان عنبریں آنکھیں
چھلک رہی ہے جوانی ہراک بنِ مُو سے
رواں ہو برگِ گُلِ تر سے جیسے سیلِ شمیم
ضیاءِ مہ میں دمکتا ہے رنگِ پیراہن
ادائے عجز سے آنچل اُڑا رہی ہے نسیم
دراز قد کی لچک سے گداز پیدا ہے
ادائے ناز سے رنگِ نیاز پیدا ہے

اداس آنکھوں میں خاموش التجائیں ہیں

دلِ حزیں میں کئی جاں بلب دعائیں ہیں

تہِ نجوم کہیں چاندنی کے دامن میں

کسی کا حسن ہے مصروفِ انتظار ابھی

کہیں خیال کے آباد کردہ گلشن میں

ہے ایک گُل کہ ہے ناواقفِ بہار ابھی

حسن اور موت

جو پھول سارے گلستاں میں سب سے اچھا ہو
فروغِ نور ہو جس سے فضائے رنگیں میں
خزاں کے جور و ستم کو نہ جس نے دیکھا ہو
بہار نے جسے خونِ جگر سے پالا ہو
وہ ایک پھول سماتا ہے چشمِ گلچیں میں

ہزار پھولوں سے آباد باغِ ہستی ہے
اجل کی آنکھ فقط ایک کو ترستی ہے
کئی دلوں کی اُمیدوں کا جو سہارا ہو
فضائے دہر کی آلودگی سے بالا ہو

جہاں میں آ کے ابھی جس نے کچھ نہ دیکھا ہو
نہ قحطِ عیش و مسرت، نہ غم کی ارزانی

کنارِ رحمتِ حق میں اسے سلاتی ہے
سکوتِ شب میں فرشتوں کی مرثیہ خوانی
طواف کرنے کو صبحِ بہار آتی ہے
صبا چڑھانے کو جنت کے پھول لاتی ہے

تین منظر

تصوّر

شوخیاں مضطرِ نگاہِ دیدۂ سرشار میں
عشرتیں خوابیدہ رنگِ غازۂ رُخسار میں
سرخ ہونٹوں پر تبسّم کی ضیائیں جس طرح
یاسمن کے پھول ڈوبے ہوں مے گلنار میں

سامنا

چھنتی ہوئی نظروں سے جذبات کی دنیائیں
بے خوابیاں، افسانے، مہتاب، تمنّائیں
کچھ اُلجھی ہوئی باتیں، کچھ بہکے ہوئے نغمے
کچھ اشک جو آنکھوں سے بے وجہ چھلک جائیں

رخصت

فسردہ رُخ، لبوں پر اِک نیاز آمیز خاموشی
تبسم مضمحل تھا، مرمریں ہاتھوں میں لرزش تھی
وہ کیسی بے کسی تھی تیری پُرتمکیں نگاہوں میں
وہ کیا دُکھ تھا تری سہمی ہوئی خاموش آہوں میں

سُرود

موت اپنی ، نہ عمل اپنا ، نہ جینا اپنا
کھو گیا شورشِ گیتی میں قرینہ اپنا

ناخدا دُور ، ہوا تیز ، قریں کامِ نہنگ
وقت ہے پھینک دے لہروں میں سفینہ اپنا

عرصۂ دہر کے ہنگامے تہِ خواب سہی
گرم رکھ آتشِ پیکار سے سینہ اپنا

ساقیا رنج نہ کر جاگ اُٹھے گی محفل
اور کچھ دیر اُٹھا رکھتے ہیں پینا اپنا

بیش قیمت ہیں یہ غمہائے محبت مت بھول
ظلمتِ یاس کو مت سونپ خزینہ اپنا

یاس

بربطِ دل کے تار ٹوٹ گئے
ہیں زمیں بوس راحتوں کے محل
مٹ گئے قصّہ ہائے فکر و عمل
بزمِ ہستی کے جام پھوٹ گئے
چھن گیا کیفِ کوثر و تسنیم
زحمتِ گریہ و بُکا بے سُود
شکوۂ بختِ نارسا بے سُود
ہو چکا ختم رحمتوں کا نزُول
بند ہے مُدّتوں سے بابِ قبُول
بے نیازِ دعا ہے ربِّ کریم

بجھ گئی شمعِ آرزوئے جمیل
یاد باقی ہے بے کسی کی دلیل
انتظارِ فضول رہنے دے
رازِ الفت نباہنے والے
بارِ غم سے کراہنے والے
کاوشِ بے حصول رہنے دے

آج کی رات

آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ

دُکھ سے بھرپور دن تمام ہوئے
اور کل کی خبر کسے معلوم
دوش و فردا کی مٹ چکی ہیں حدود
ہو نہ ہو اب سحر کسے معلوم
زندگی ہیچ! لیکن آج کی رات
ایزدیت ہے ممکن آج کی رات
آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ

۳۴ء

اب نہ دُہرا فسانہ ہائے اَلَم
اپنی قسمت پہ سوگوار نہ ہو
فکرِ فردا اُتار دے دل سے
عمرِ رفتہ پہ اشکبار نہ ہو
عہدِ غم کی حکایتیں مت پوچھ
ہو چکیں سب شکایتیں، مت پوچھ
آج کی رات سازِ درد نہ چھیڑ!

ایک رہگزر پر

وہ جس کی دید میں لاکھوں مسرتیں پنہاں

وہ حسن جس کی تمنا میں جنتیں پنہاں

ہزار فتنے تہِ پائے ناز، خاک نشیں

ہر اک نگاہ خمارِ شباب سے رنگیں

شباب جس سے تخیل پہ بجلیاں برسیں

وقار، جس کی رفاقت کو شوخیاں ترسیں

ادائے لغزشِ پا پر قیامتیں قرباں

بیاضِ رخ پہ سحر کی صباحتیں قرباں

سیاہ زلفوں میں وارفتہ نکہتوں کا ہجوم

طویل راتوں کی خوابیدہ راحتوں کا ہجوم

وہ آنکھ جس کے بناؤ پہ خالق اِترائے
زبانِ شعر کو تعریف کرتے شرم آئے

وہ ہونٹ فیض سے جن کے بہارِ لالہ فروش
بہشت و کوثر و تسنیم و سلسبیل بدوش

گداز جسم، قبا جس پہ سج کے ناز کرے
دراز قد جسے سروِ سہی نماز کرے

غرض وہ حسن جو محتاجِ وصف و نام نہیں
وہ حسن جس کا تصوّر بشر کا کام نہیں

کسی زمانے میں اس رہگزر سے گزرا تھا
بصد غرور و تجمل اِدھر سے گزرا تھا

اور اب یہ راہگزر بھی ہے دلفریب و حسیں
ہے اس کی خاک میں کیفِ شرابِ و شعرِ مکیں

ہوا میں شوخیِ رفتار کی ادائیں ہیں
فضا میں نرمیِ گفتار کی صدائیں ہیں

غرض وہ حسن اب اس رہ کا جزوِ منظر ہے
نیازِ عشق کو اک سجدہ گہ میسّر ہے

ایک منظر

بام و در خامشی کے بوجھ سے چُور
آسمانوں سے جُوئے درد رواں
چاند کا دُکھ بھرا فسانۂ نور
شاہراہوں کی خاک میں غلطاں
خواب گاہوں میں نیم تاریکی
مضمحل لَے ربابِ ہستی کی
ہلکے ہلکے سُروں میں نوحہ کناں

میرے ندیم!

خیال و شعر کی دنیا میں جان تھی جن سے
فضائے فکر و عمل ارغوان تھی جن سے
وہ جن کے نور سے شاداب تھے مہ و انجم
جنونِ عشق کی ہمت جوان تھی جن سے
وہ آرزوئیں کہاں سو گئی ہیں میرے ندیم!

وہ ناصبور نگاہیں، وہ منتظِر راہیں
وہ پاسِ ضبط سے دل میں دبی ہوئی آہیں
وہ اِنتظار کی راتیں، طویل تیرہ و تار
وہ نیم خواب شبستاں، وہ مخملیں باہیں
کہانیاں تھیں، کہیں کھو گئی ہیں، میرے ندیم!

مچل رہا ہے رگِ زندگی میں خونِ بہار

اُلجھ رہے ہیں پرانے غموں سے رُوح کے تار

چلو کہ چل کے چراغاں کریں دیارِ حبیب

ہیں اِنتظار میں اگلی محبتوں کے مزار

محبتیں جو فنا ہو گئی ہیں میرے ندیم!

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

میں نے سمجھا تھا کہ تُو ہے تو درخشاں ہے حیات

تیرا غم ہے تو غمِ دہر کا جھگڑا کیا ہے

تیری صورت سے ہے عالم میں بہاروں کو ثبات

تیری آنکھوں کے سوا دُنیا میں رکھا کیا ہے

تو جو مِل جائے تو تقدیر نگوں ہو جائے

یُوں نہ تھا، میں نے فقط چاہا تھا یُوں ہو جائے

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا

راحتیں اور بھی ہیں وصل کی راحت کے سوا

اَن گِنت صدیوں کے تاریک بہیمانہ طلسم
ریشم و اطلس و کمخاب میں بُنوائے ہوئے
جا بجا بکتے ہوئے کوچہ و بازار میں جسم
خاک میں لتھڑے ہوئے خون میں نہلائے ہوئے
لَوٹ جاتی ہے اُدھر کو بھی نظر کیا کیجے
اب بھی دلکش ہے ترا حُسن، مگر کیا کیجے

اور بھی دُکھ ہیں زمانے میں محبت کے سوا
راحتیں اور بھی ہیں وَصل کی راحت کے سوا
مجھ سے پہلی سی محبت مرے محبوب نہ مانگ

سوچ

کیوں میرا دل شاد نہیں ہے
کیوں خاموش رہا کرتا ہوں

چھوڑو میری رام کہانی
میں جیسا بھی ہوں اچھا ہوں

میرا دل غمگیں ہے تو کیا
غمگیں یہ دنیا ہے ساری

یہ دکھ تیرا ہے نہ میرا
ہم سب کی جاگیر ہے پیاری

تو گر میری بھی ہو جائے
دنیا کے غم یونہی رہیں گے

پاپ کے پھندے، ظلم کے بندھن
اپنے کہے سے کٹ نہ سکیں گے

غم ہر حالت میں مُہلک ہے
اپنا ہو یا اور کسی کا

رونا دھونا، جی کو جلانا
یوں بھی ہمارا، یوں بھی ہمارا

کیوں نہ جہاں کا غم اپنا لیں
بعد میں سب تدبیریں سوچیں

بعد میں سکھ کے سپنے دیکھیں
سپنوں کی تعبیریں سوچیں

بے فکرے دھن دولت والے
یہ آخر کیوں خوش رہتے ہیں

ان کا سکھ آپس میں بانٹیں
یہ بھی آخر ہم جیسے ہیں

ہم نے مانا جنگ کڑی ہے
سر پھوٹیں گے خون بہے گا

خون میں غم بھی بہ جائیں گے
ہم نہ رہیں، غم بھی نہ رہے گا

رقیب سے!

آ کہ وابستہ ہیں اُس حُسن کی یادیں تجھ سے
جس نے اس دل کو پری خانہ بنا رکھا تھا
جس کی اُلفت میں بھلا رکھی تھی دُنیا ہم نے
دہر کو دہر کا افسانہ بنا رکھا تھا

آشنا ہیں ترے قدموں سے وہ راہیں جن پر
اُس کی مدہوش جوانی نے عنایت کی ہے
کارواں گزرے ہیں جن سے اُسی رعنائی کے
جس کی اِن آنکھوں نے بے سُود عبادت کی ہے

تجھ سے کھیلی ہیں وہ محبوب ہوائیں جن میں
اُس کے ملبوس کی افسردہ مہک باقی ہے
تجھ پہ بھی برسا ہے اُس بام سے مہتاب کا نور
جس میں بیتی ہوئی راتوں کی کسک باقی ہے
تو نے دیکھی ہے، وہ پیشانی، وہ رخسار، وہ ہونٹ
زندگی جن کے تصور میں لٹا دی ہم نے
تجھ پہ اُٹھی ہیں وہ کھوئی ہوئی ساحر آنکھیں
تجھ کو معلوم ہے کیوں عُمر گنوا دی ہم نے
مشترک ہم پہ ہیں احسان غمِ اُلفت کے
اتنے احسان کہ گِنواؤں تو گِنوا نہ سکوں
ہم نے اس عشق میں کیا کھویا ہے کیا سیکھا ہے
جُز ترے اور کو سمجھاؤں تو سمجھا نہ سکوں

عاجزی سیکھی، غریبوں کی حمایت سیکھی
یاس و حرمان کے، دُکھ درد کے معنی سیکھے
زیردستوں کے مصائب کو سمجھنا سیکھا
سرد آہوں کے، رُخِ زرد کے معنی سیکھے

جب کہیں بیٹھ کے روتے ہیں وہ بیکس جن کے
اشک آنکھوں میں بلکتے ہوئے سو جاتے ہیں
ناتوانوں کے نوالوں پہ جھپٹتے ہیں عقاب
بازو تولے ہوئے منڈلاتے ہوئے آتے ہیں

جب کبھی بکتا ہے بازار میں مزدور کا گوشت
شاہراہوں پہ غریبوں کا لہُو بہتا ہے
آگ سی سینے میں رہ رہ کے اُبلتی ہے نہ پوچھ
اپنے دل پر مجھے قابو ہی نہیں رہتا ہے

تنہائی

پھر کوئی آیا دلِ زار! نہیں کوئی نہیں
راہرو ہو گا، کہیں اور چلا جائے گا
ڈھل چکی رات، بکھرنے لگا تاروں کا غبار
لڑکھڑانے لگے ایوانوں میں خوابیدہ چراغ
سو گئی راستہ تک تک کے ہر اک راہگزار
اجنبی خاک نے دھندلا دیے قدموں کے سراغ
گُل کرو شمعیں، بڑھا دو مے و مینا و ایاغ
اپنے بے خواب کواڑوں کو مقفّل کر دو
اب یہاں کوئی نہیں، کوئی نہیں آئے گا

چند روز اور مری جان!

چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز
ظلم کی چھاؤں میں دم لینے پہ مجبور ہیں ہم
اور کچھ دیر ستم سہہ لیں، تڑپ لیں، رو لیں
اپنے اجداد کی میراث ہے معذور ہیں ہم
جسم پر قید ہے، جذبات پہ زنجیریں ہیں
فکر محبوس ہے، گفتار پہ تعزیریں ہیں
اپنی ہمت ہے کہ ہم پھر بھی جیے جاتے ہیں
زندگی کیا کسی مُفلِس کی قبا ہے جس میں
ہر گھڑی درد کے پیوند لگے جاتے ہیں

لیکن اب ظلم کی میعاد کے دن تھوڑے ہیں

اک ذرا صبر، کہ فریاد کے دن تھوڑے ہیں

عرصۂ دہر کی جُھلسی ہوئی ویرانی میں

ہم کو رہنا ہے پہ یونہی تو نہیں رہنا ہے

اجنبی ہاتھوں کے بے نام گرانبار ستم

آج سہنا ہے، ہمیشہ تو نہیں سہنا ہے

یہ ترے حسن سے لپٹی ہوئی آلام کی گرد

اپنی دو روزہ جوانی کی شکستوں کا شمار

چاندنی راتوں کا بے کار دہکتا ہُوا درد

دل کی بے سُود تڑپ، جسم کی مایوس پکار

چند روز اور مری جان! فقط چند ہی روز

مرگِ سوزِ محبت

آؤ کہ مرگِ سوزِ محبت منائیں ہم
آؤ کہ حسنِ ماہ سے دل کو جلائیں ہم

خوش ہوں فراقِ قامت و رخسارِ یار سے
سرو و گل و سمن سے نظر کو ستائیں ہم

ویرانیِ حیات کو ویران تر کریں
لے ناصح آج تیرا کہا مان جائیں ہم

پھر اوٹ لے کے دامنِ ابرِ بہار کی
دل کو منائیں ہم کبھی آنسو بہائیں ہم

سلجھائیں بے دلی سے یہ اُلجھے ہوئے سوال
واں جائیں یا نہ جائیں، نہ جائیں کہ جائیں ہم

پھر دل کو پاسِ ضبط کی تلقین کر چکیں
اور امتحانِ ضبط سے پھر جی چرائیں ہم
آؤ کہ آج ختم ہوئی داستانِ عشق
اب ختمِ عاشقی کے فسانے سنائیں ہم

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

کُتّے

یہ گلیوں کے آوارہ بے کار کُتّے
کہ بخشا گیا جن کو ذوقِ گدائی
زمانے کی پھٹکار سرمایہ اِن کا
جہاں بھر کی دُھتکار اِن کی کمائی
نہ آرام شب کو نہ راحت سویرے
غلاظت میں گھر، نالیوں میں بسیرے
جو بگڑیں تو اِک دوسرے سے لڑا دو
ذرا ایک روٹی کا ٹکڑا دِکھا دو
یہ ہر ایک کی ٹھوکریں کھانے والے
یہ فاقوں سے اُکتا کے مر جانے والے

یہ مظلوم مخلوق گر سر اٹھائے
تو انسان سب سرکشی بھول جائے
یہ چاہیں تو دنیا کو اپنا بنالیں
یہ آقاؤں کی ہڈیاں تک چبالیں
کوئی اِن کو اِحساسِ ذِلّت دِلا دے
کوئی اِن کی سوئی ہوئی دُم ہلا دے

بول

بول ، کہ لب آزاد ہیں تیرے
بول ، زباں اب تک تیری ہے
تیرا ستواں جسم ہے تیرا
بول کہ جاں اب تک تیری ہے
دیکھ کہ آہنگر کی دوکاں میں
تُند ہیں شُعلے سُرخ ہے آہن
کھُلنے لگے قُفلوں کے دہانے
پھیلا ہر اک زنجیر کا دامن
بول ، یہ تھوڑا وقت بہت ہے
جسم و زباں کی موت سے پہلے

بول، کہ سچ زندہ ہے اب تک
بول، جو کچھ کہنا ہے کہہ لے

اِقبال

آیا ہمارے دیس میں اک خوشنوا فقیر
آیا اور اپنی دُھن میں غزل خواں گزر گیا
سُنسان راہیں خلق سے آباد ہو گئیں
ویران میکدوں کا نصیبہ سنور گیا
تھیں چند ہی نگاہیں جو اس تک پہنچ سکیں
پر اس کا گیت سب کے دلوں میں اُتر گیا
اب دُور جا چکا ہے وہ شاہِ گدا نما
اور پھر سے اپنے دیس کی راہیں اُداس ہیں
چند اک کو یاد ہے کوئی اس کی ادائے خاص
دو اک نگاہیں چند عزیزوں کے پاس ہیں

پر اُس کا گیت سب کے دِلوں میں مقیم ہے
اور اُس کی لَے سے سینکڑوں لذّت شناس ہیں
اس گیت کے تمام محاسن ہیں لازوال
اس کا وفور، اس کا خروش، اس کا سوز و ساز
یہ گیت مثلِ شعلۂ جوّالہ تُند و تیز
اس کی لپک سے بادِ فنا کا جگر گُداز
جیسے چراغ وحشتِ صرصر سے بے خطر
یا شمعِ بزم صبح کی آمد سے بے خبر

موضوعِ سخن

گُل ہوئی جاتی ہے افسردہ سُلگتی ہوئی شام

ڈھل کے نکلے گی ابھی چشمۂ مہتاب سے رات

اور مُشتاق نگاہوں کی سُنی جائے گی

اور اُن ہاتھوں سے مَس ہونگے یہ ترسے ہوئے ہات

ان کا آنچل ہے، کہ رخسار، کہ پیراہن ہے

کچھ تو ہے جس سے ہوئی جاتی ہے چِلمن رنگیں

جانے اس زلف کی موہوم گھنی چھاؤں میں

ٹمٹماتا ہے وہ آویزہ ابھی تک کہ نہیں

آج پھر حُسنِ دلآرا کی وہی دھج ہو گی

وہی خوابیدہ سی آنکھیں، وہی کاجل کی لکیر

رنگِ رخسار پہ ہلکا سا وہ غازے کا غبار
صندلی ہاتھ پہ دھندلی سی حنا کی تحریر
اپنے افکار کی ، اشعار کی دنیا ہے یہی
جانِ مضموں ہے یہی ، شاہدِ معنیٰ ہے یہی
آج تک سُرخ و سیہ صدیوں کے سائے کے تلے
آدم و حوّا کی اولاد پہ کیا گزری ہے؟
موت اور زیست کی روزانہ صف آرائی میں
ہم پہ کیا گزرے گی ، اجداد پہ کیا گزری ہے؟
ان دمکتے ہوئے شہروں کی فراواں مخلوق
کیوں فقط مرنے کی حسرت میں جیا کرتی ہے
یہ حسیں کھیت ، پھٹا پڑتا ہے جوبن جن کا
کس لیے اِن میں فقط بھوک اُگا کرتی ہے

یہ ہر اک سمت پُراسرار کڑی دیواریں
جل بُجھے جن میں ہزاروں کی جوانی کے چراغ
یہ ہر اک گام پہ ان خوابوں کی مقتل گاہیں
جن کے پرتَو سے چراغاں ہیں ہزاروں کے دماغ
یہ بھی ہیں ایسے کئی اور بھی مضموں ہوں گے
لیکن اُس شوخ کے آہستہ سے کھلتے ہوئے ہونٹ
ہائے اُس جسم کے کمبخت دلآویز خطوط
آپ ہی کہیے کہیں ایسے بھی افسوں ہوں گے
اپنا موضوعِ سخن اِن کے سوا اور نہیں
طبعِ شاعر کا وطن اِن کے سوا اور نہیں

ہم لوگ

دل کے ایواں میں لیے گُل شدہ شمعوں کی قطار
نورِ خورشید سے سہمے ہوئے اکتائے ہوئے
حسنِ محبوب کے سیّال تصوّر کی طرح
اپنی تاریکی کو بھینچے ہوئے، لپٹائے ہوئے
غایتِ سود و زیاں، صورتِ آغاز و مآل
وہی بے سود تجسّس، وہی بے کار سوال
مُضمحل ساعتِ امروز کی بے رنگی سے
یادِ ماضی سے غمیں، دہشتِ فردا سے نڈھال
تشنہ افکار جو تسکین نہیں پاتے ہیں
سوختہ اشک جو آنکھوں میں نہیں آتے ہیں

اک کڑا درد کہ جو گیت میں ڈھلتا ہی نہیں
دِل کے تاریک شگافوں سے نکلتا ہی نہیں
اور اک اُلجھی ہوئی موہوم سی درماں کی تلاش
دشت و زنداں کی ہوس، چاکِ گریباں کی تلاش

شاہراہ

ایک افسردہ شاہراہ ہے دراز
دُور اُفق پر نظر جمائے ہوئے
سرد مٹّی پہ اپنے سینے کے
سُرمگیں حُسن کو بچھائے ہوئے
جس طرح کوئی غمزدہ عورت
اپنے ویراں کدے میں محوِ خیال
وصلِ محبوب کے تصوّر میں
مُو بمُو چُور، عُضو عُضو نڈھال

اے دلِ بیتاب ٹھہر!

تیرگی ہے کہ اُمنڈتی ہی چلی آتی ہے
شب کی رگ رگ سے لہو پھوٹ رہا ہو جیسے
چل رہی ہے کچھ اس انداز سے نبضِ ہستی
دونوں عالم کا نشہ ٹوٹ رہا ہو جیسے
رات کا گرم لہو اور بھی بہہ جانے دو
یہی تاریکی تو ہے غازۂ رخسارِ سحر
صبح ہونے ہی کو ہے، اے دلِ بیتاب ٹھہر

ابھی زنجیر چھنکتی ہے پسِ پردۂ ساز
مُطلق الحکم ہے شیرازۂ اسباب ابھی

ساغرِ ناب میں آنسو بھی ڈھلک جاتے ہیں

لغزشِ پا میں ہے پابندیِ آداب ابھی

اپنے دیوانوں کو دیوانہ تو بن لینے دو

اپنے میخانوں کو میخانہ تو بن لینے دو

جلد یہ سطوتِ اسباب بھی اُٹھ جائے گی

یہ گرانباریِ آداب بھی اُٹھ جائے گی

خواہ زنجیر چھنکتی ہی چھنکتی ہی رہے

سیاسی لیڈر کے نام

سالہا سال یہ بے آسرا جکڑے ہوئے ہاتھ
رات کے سخت و سیہ سینے میں پیوست رہے
جس طرح تنکا سمندر سے ہو سرگرمِ ستیز
جس طرح تیتری کہسار پر یلغار کرے
اور اب رات کے سنگین و سیہ سینے میں
اتنے گھاؤ ہیں کہ جس سمت نظر جاتی ہے
جا بجا نور نے اک جال سا بُن رکھا ہے
دور سے صبح کی دھڑکن کی صدا آتی ہے
تیرا سرمایہ، تیری آس یہی ہاتھ تو ہیں
اور کچھ بھی تو نہیں پاس، یہی ہاتھ تو ہیں

تجھ کو منظور نہیں غلبۂ ظلمت لیکن
تجھ کو منظور ہے یہ ہاتھ قلم ہو جائیں
اور مشرق کی کمیں گہ میں دھڑکتا ہوا دن
رات کی آہنی میت کے تلے دب جائے!

مرے ہمدم، مرے دوست!

گر مجھے اِس کا یقیں ہو مرے ہمدم، مرے دوست!
گر مجھے اِس کا یقیں ہو کہ ترے دل کی تھکن
تری آنکھوں کی اُداسی، ترے سینے کی جلن
میری دلجوئی، مرے پیار سے مٹ جائے گی؛
گر مرا حرفِ تسلّی وہ دوا ہو جس سے
جی اُٹھے پھر ترا اُجڑا ہوا بے نُور دماغ
تیری پیشانی سے دُھل جائیں یہ تذلیل کے داغ
تیری بیمار جوانی کو شفا ہو جائے؛
گر مجھے اِس کا یقیں ہو مرے ہمدم مرے دوست

روز و شب، شام و سحر میں تجھے بہلاتا رہوں
میں تجھے گیت سُناتا رہوں ہلکے شیریں
آبشاروں کے، بہاروں کے، چمن زاروں کے گیت
آمدِ صبح کے، مہتاب کے، سیاروں کے گیت
تجھ سے میں حسن و محبت کی حکایات کہوں؛
کیسے مغرور حسیناؤں کے برفاب سے جسم
گرم ہاتھوں کی حرارت میں پگھل جاتے ہیں
کیسے اک چہرے کے ٹھہرے ہوئے مانوس نقوش
دیکھتے دیکھتے یک لخت بدل جاتے ہیں
کس طرح عارضِ محبوب کا شفاف بلور
یک بیک بادۂ احمر سے دہک جاتا ہے؛
کیسے گلچیں کے لیے جھکتی ہے خود شاخِ گلاب

کس طرح رات کا ایوان مہک جاتا ہے

یوں ہی گاتا رہوں، گاتا رہوں تیری خاطر
گیت بُنتا رہوں، بیٹھا رہوں تیری خاطر

پر مرے گیت ترے دُکھ کا مداوا ہی نہیں
نغمہ جرّاح نہیں، مُونس و غم خوار سہی
گیت نِشتر تو نہیں، مرہمِ آزار سہی
تیرے آزار کا چارہ نہیں، نِشتر کے سوا
اور یہ سفّاک مسیحا مرے قبضے میں نہیں
اس جہاں کے کسی ذی رُوح کے قبضے میں نہیں
ہاں مگر تیرے سِوا، تیرے سِوا، تیرے سِوا

صبحِ آزادی

اگست ۱۹۴۷ء

یہ داغ داغ اُجالا، یہ شب گزیدہ سحر
وہ انتظار تھا جس کا، یہ وہ سحر تو نہیں
یہ وہ سحر تو نہیں جس کی آرزو لے کر
چلے تھے یار کہ مل جائے گی کہیں نہ کہیں
فلک کے دشت میں تاروں کی آخری منزل
کہیں تو ہو گا شبِ سُست موج کا ساحل
کہیں تو جا کے رُکے گا سفینۂ غمِ دل
جواں لہُو کی پُر اسرار شاہراہوں سے
چلے جو یار تو دامن پہ کتنے ہاتھ پڑے
دیارِ حُسن کی بے صبر خواب گاہوں سے

پکارتی رہیں باہیں، بدن بلاتے رہے
بہت عزیز تھی لیکن رُخِ سحر کی لگن
بہت قریں تھا حسینانِ نُور کا دامن
سُبک سُبک تھی تمنا، دبی دبی تھی تھکن

سُنا ہے ہو بھی چکا ہے فراقِ ظلمت و نُور
سُنا ہے ہو بھی چکا ہے وصالِ منزل و گام
بدل چکا ہے بہت اہلِ درد کا دستور
نشاطِ وصل حلال و عذابِ ہجر حرام
جگر کی آگ، نظر کی اُمنگ، دل کی جلن
کسی پہ چارۂ ہجراں کا کچھ اثر ہی نہیں
کہاں سے آئی نگارِ صبا، کدھر کو گئی
ابھی چراغِ سرِ رہ کو کچھ خبر ہی نہیں

ابھی گرانیِ شب میں کمی نہیں آئی
نجاتِ دیدہ و دل کی گھڑی نہیں آئی
چلے چلو کہ وہ منزل ابھی نہیں آئی!

لوح و قلم

ہم پرورشِ لوح و قلم کرتے رہیں گے
جو دل پہ گزرتی ہے رقم کرتے رہیں گے

اسبابِ غمِ عشق بہم کرتے رہیں گے
ویرانیِ دوراں پہ کرم کرتے رہیں گے

ہاں تلخیِ ایام ابھی اور بڑھے گی
ہاں اہلِ ستم مشقِ ستم کرتے رہیں گے

منظور یہ تلخی، یہ ستم ہم کو گوارا
دم ہے تو مداوائے اَلَم کرتے رہیں گے

مے خانہ سلامت ہے تو ہم سرخیِ مے سے
تزئینِ در و بامِ حرم کرتے رہیں گے

باقی ہے لہُو دل میں تو ہر اشک سے پیدا
رنگِ لب و رخسارِ صنم کرتے رہیں گے
اک طرزِ تغافل ہے سو وہ اُن کو مُبارک
اک عرضِ تمنّا ہے سو ہم کرتے رہیں گے

شورشِ بربط و نے

پہلی آواز

اب سعی کا اِمکاں اور نہیں پرواز کا مضموں ہو بھی چکا

تاروں پہ کمندیں پھینک چکے، مہتاب پہ شبخوں ہو بھی چکا

اب، اور کسی فردا کے لیے ان آنکھوں سے کیا پیماں کیجے

کس خواب کے جھوٹے افسوں سے تسکینِ دلِ ناداں کیجے

شیرینیِ لب، خوشبوئے دہن، اب شوق کا عنواں کوئی نہیں

شادابیِ دل، تفریحِ نظر، اب زیست کا درماں کوئی نہیں

جینے کے فسانے رہنے دو، اب ان میں اُلجھ کر کیا لیں گے

اک موت کا دھندا باقی ہے، جب چاہیں گے نپٹا لیں گے

یہ تیرا کفن، وہ میرا کفن، یہ میری لحد، وہ تیری ہے۔

دوسری آواز

ہستی کی متاعِ بے پایاں، جاگیر تری ہے نہ میری ہے
اس بزم میں اپنی مشعلِ دل، بسمل ہے تو کیا، رخشاں ہے تو کیا
یہ بزم چراغاں رہتی ہے، اک طاق اگر ویراں ہے تو کیا
افسردہ ہیں گر ایام ترے، بدلا نہیں مسلکِ شام و سحر
ٹھہرے نہیں موسمِ گل کے قدم، قائم ہے جمالِ شمس و قمر
آباد ہے وادیِ کاکل و لب، شاداب و حسیں گلگشتِ نظر
مقسوم ہے لذتِ دردِ جگر، موجود ہے نعمتِ دیدۂ تر
اس دیدۂ تر کا شکر کرو، اس ذوقِ نظر کا شکر کرو
اس شام و سحر کا شکر کرو، ان شمس و قمر کا شکر کرو

پہلی آواز

گر ہے یہی مسلکِ شمس و قمر ان شمس و قمر کا کیا ہوگا
رعنائیِ شب کا کیا ہوگا، اندازِ سحر کا کیا ہوگا

جب خونِ جگر برفاب بنا، جب آنکھیں آہن پوش ہوئیں
اس دیدۂ تر کا کیا ہوگا، اس ذوقِ نظر کا کیا ہوگا

جب شعر کے خیمے راکھ ہوئے، نغموں کی طنابیں ٹوٹ گئیں
یہ ساز کہاں سر پھوڑیں گے، اس کلکِ گہر کا کیا ہوگا

جب کنجِ قفس مسکن ٹھہرا، اور جیب و گریباں طوق و رسن
آئے کہ نہ آئے موسمِ گل اِس دردِ جگر کا کیا ہوگا

دُوسری آواز

یہ ہاتھ سلامت ہیں جبتک، اس خوں میں حرارت ہے جبتک
اِس دل میں صداقت ہے جبتک، اس نُطق میں طاقت ہے جبتک
ان طوق و سلاسل کو ہم تم، سکھلائیں گے شورشِ بربط و نَے
وہ شورش جس کے آگے زبُوں ہنگامۂ طبلِ قیصر و کَے
آزاد ہیں اپنے فکر و عمل بھرپور خزینہ ہمت کا
اک عمر ہے اپنی ہر ساعت، اِمروز ہے اپنا ہر فردا
یہ شام و سحر یہ شمس و قمر، یہ اختر و کوکب اپنے ہیں
یہ لَوح و قلَم، یہ طبل و علَم، یہ مال و حَشَم سب اپنے ہیں

دامنِ یوسف

جاں بیچنے کو آئے تو بے دام بیچ دی
اے اہلِ مصر وضعِ تکلّف تو دیکھیے
انصاف ہے کہ حکمِ عقوبت سے پیشتر
اک بار سوئے دامنِ یوسف تو دیکھیے

طوق و دار کا موسم

روش روش ہے وہی انتظار کا موسم
نہیں ہے کوئی بھی موسم بہار کا موسم

گراں ہے دل پہ غمِ روزگار کا موسم
ہے آزمائشِ حسنِ نگار کا موسم

خوشا نظارۂ رخسارِ یار کی ساعت
خوشا قرارِ دلِ بے قرار کا موسم

حدیثِ بادہ و ساقی نہیں تو کس مصرف
خرامِ ابرِ سرِ کوہسار کا موسم

نصیب صحبتِ یاراں نہیں تو کیا کیجے
یہ رقصِ سایۂ سرو و چنار کا موسم

یہ دل کے داغ تو دُکھتے تھے یوں بھی پر کم کم
کچھ اب کے اور ہے ہجرانِ یار کا موسم

یہی جنوں کا، یہی طوق و دار کا موسم
یہی ہے جبر یہی اختیار کا موسم

قفس ہے بس میں تمہارے، تمہارے بس میں نہیں
چمن میں آتشِ گُل کے نکھار کا موسم

صبا کی مست خرامی تہِ کمند نہیں
اسیرِ دام نہیں ہے بہار کا موسم

بلا سے ہم نے نہ دیکھا تو اور دیکھیں گے

فروغِ گلشن و صوتِ ہزار کا موسم

(قوالی)

کہاں ہے منزلِ راہِ تمنا ہم بھی دیکھیں گے
یہ شب ہم پر بھی گزرے گی یہ فردا ہم بھی دیکھیں گے
ٹھہر اے دل، جمالِ روئے زیبا ہم بھی دیکھیں گے

ذرا صیقل تو ہو لے تشنگی بادہ گساروں کی
دبا رکھیں گے کب تک جوشِ صہبا ہم بھی دیکھیں گے
اٹھا رکھیں گے کب تک جام و مینا ہم بھی دیکھیں گے

صلا آ تو چکے محفل میں اُس کوئے ملامت سے
کسے روکے گا شورِ پندِ بے جا ہم بھی دیکھیں گے
کسے ہے جا کے لوٹ آنے کا یارا ہم بھی دیکھیں گے

چلے ہیں جان و ایماں آزمانے آج دل والے
وہ لائیں لشکرِ اغیار و اعدا ہم بھی دیکھیں گے
وہ آئیں تو سرِ مقتل، تماشا ہم بھی دیکھیں گے

یہ شب کی آخری ساعت گراں کیسی بھی ہو ہمدم
جو اس ساعت میں پنہاں ہے اُجالا ہم بھی دیکھیں گے
جو فرقِ صبح پر چمکے گا تارا ہم بھی دیکھیں گے

تمہارے حُسن کے نام

سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حُسن کے نام!

بکھر گیا جو کبھی رنگِ پیرہن سرِ بام
نکھر گئی ہے کبھی صبح، دوپہر، کبھی شام
کہیں جو قامتِ زیبا پہ سج گئی ہے قبا
چمن میں سرو و صنوبر سنور گئے ہیں تمام
بنی بساطِ غزل جب ڈبو لیے دل نے
تمہارے سایۂ رخسار و لب میں ساغر و جام

سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حسن کے نام!

تمہارے ہاتھ پہ ہے تابشِ حنا جب تک
جہاں میں باقی ہے دلداریِ عروسِ سخن

تمہارا حُسن جواں ہے تو مہرباں ہے فلک
تمہارا دم ہے تو دمساز ہے ہوائے وطن
اگرچہ تنگ ہیں اَوقات، سخت ہیں آلام
تمہاری یاد سے شیریں ہے تلخیٔ ایّام

سلام لکھتا ہے شاعر تمہارے حُسن کے نام!

ترانہ

دربارِ وطن میں جب اک دن سب جانے والے جائیں گے
کچھ اپنی سزا کو پہنچیں گے، کچھ اپنی جزا لے جائیں گے

اے خاک نشینو اُٹھ بیٹھو وہ وقت قریب آپہنچا ہے
جب تخت گرائے جائیں گے جب تاج اُچھالے جائیں گے

اب ٹوٹ گریں گی زنجیریں اب زندانوں کی خیر نہیں
جو دریا جھوم کے اُٹھے ہیں تنکوں سے نہ ٹالے جائیں گے

کٹتے بھی چلو، بڑھتے بھی چلو، بازو بھی بہت ہیں سر بھی بہت
چلتے بھی چلو کہ اب ڈیرے منزل ہی پہ ڈالے جائیں گے

اے ظلم کے ماتو لب کھولو چُپ رہنے والو چُپ کب تک
کچھ حشر تو ان سے اُٹھے گا، کچھ دور تو نالے جائیں گے

دو عشق

(۱)

تازہ ہیں ابھی یاد میں اے ساقیِ گلفام
وہ عکسِ رُخِ یار سے لہکے ہوئے ایام
وہ پھول سی کِھلتی ہوئی دیدار کی ساعت
وہ دل سا دھڑکتا ہوا اُمید کا ہنگام
اُمید کہ لو جاگا غمِ دل کا نصیبہ
لو شوق کی ترسی ہوئی شب ہو گئی آخر
لو ڈوب گئے درد کے بے خواب ستارے
اب چمکے گا بے صبر نگاہوں کا مُقدّر
اِس بام سے نکلے گا ترے حُسن کا خورشید
اُس کُنج سے پھوٹے گی کِرن رنگِ حنا کی

اِس در سے بہے گا تری رفتار کا سیماب
اُس راہ پہ پھوٹے گی شفق تیری قبا کی

پھر دیکھے ہیں وہ ہجر کے تپتے ہوئے دن بھی
جب فکرِ دل و جاں میں فُغاں بھول گئی ہے
ہر شب وہ سیہ بوجھ کہ دل بیٹھ گیا ہے
ہر صبح کی لَو تیر سی سینے میں لگی ہے
تنہائی میں کیا کیا نہ تجھے یاد کیا ہے
کیا کیا نہ دِلِ زار نے ڈھونڈی ہیں پناہیں
آنکھوں سے لگایا ہے کبھی دستِ صبا کو
ڈالی ہیں کبھی گردنِ مہتاب میں باہیں

(۲)

چاہا ہے اسی رنگ میں لیلائے وطن کو
تڑپا ہے اسی طور سے دِل اس کی لگن میں
ڈھونڈی ہے یُونہی شوق نے آسائشِ منزل
رُخسار کے خم میں کبھی کاکُل کی شکن میں
اس جانِ جہاں کو بھی یونہی قلب و نظر نے
ہنس ہنس کے صدا دی کبھی رو رو کے پکارا
پورے کیے سب حرفِ تمنا کے تقاضے
ہر درد کو اُجیالا، ہر اِک غم کو سنوارا
واپس نہیں پھیرا کوئی فرمان جنوں کا
تنہا نہیں لَوٹی کبھی آواز جرس کی

خیریتِ جاں، راحتِ تن، صحتِ داماں
سب بھول گئیں مصلحتیں اہلِ ہوس کی

اس راہ میں جو سب پہ گزرتی ہے وہ گزری
تنہا پسِ زنداں، کبھی رسوا سرِ بازار

گرجے ہیں بہت شیخ سرِ گوشۂ منبر
کڑکے ہیں بہت اہلِ حکم برسرِ دربار

چھوڑا نہیں غیروں نے کوئی ناوکِ دشنام
چھوٹی نہیں اپنوں سے کوئی طرزِ ملامت

اِس عشق، نہ اُس عشق پہ نادم ہے مگر دل
ہر داغ ہے اِس دِل میں بجز داغِ ندامت

نوحہ

مجھ کو شکوہ ہے مرے بھائی کہ تم جاتے ہوئے
لے گئے ساتھ مری عمرِ گذشتہ کی کتاب
اس میں تو میری بہت قیمتی تصویریں تھیں
اس میں بچپن تھا مرا اور مرا عہدِ شباب
اس کے بدلے مجھے تم دے گئے جاتے جاتے
اپنے غم کا یہ دمکتا ہوا خوں رنگ گلاب
کیا کروں بھائی، یہ اعزاز میں کیونکر پہنوں
مجھ سے لے لو مری سب چاک قمیصوں کا حساب
آخری بار ہے، لو مان لو اک یہ بھی سوال
آج تک تم سے میں لوٹا نہیں مایوسِ جواب

آ کے لے جاؤ تم اپنا یہ دہکتا ہوا پھول
مجھ کو لوٹا دو مری عمرِ گذشتہ کی کتاب

۱۸-جولائی ۶۰۵۲

ایرانی طلبہ کے نام

جو امن اور آزادی کی جدوجہد میں کام آئے

یہ کون سخی ہیں
جن کے لہو کی

اشرفیاں، چھن چھن، چھن چھن،
دھرتی کے پیہم پیاسے
کشکول میں ڈھلتی جاتی ہیں
کشکول کو بھرتی جاتی ہیں۔

یہ کون جواں ہیں ارضِ عجم
یہ لکھ لٹ
جن کے جسموں کی

بھرپُور جوانی کا کُندن

یوں خاک میں ریزہ ریزہ ہے

یُوں کوچہ کوچہ بکھرا ہے

اے ارضِ عجم ، اے ارضِ عجم !

کیوں توڑ کے ہنس ہنس پھینک دیے

ان آنکھوں نے اپنے نیلم

ان ہونٹوں نے اپنے مرجاں

ان ہاتوں کی بے کل چاندی

کس کام آئی، کس ہاتھ لگی ؟

اے پوچھنے والے پردیسی

یہ طِفل و جواں

اُس نُور کے نَورس موتی ہیں

اُس آگ کی کچّی کلیاں ہیں
جس میٹھے نور اور کڑوی آگ
سے ظلم کی اندھی رات میں پھُوٹا
صبحِ بغاوت کا گلشن
اور صبح ہوئی من من، تن تن،
ان جسموں کا چاندی سونا
ان چہروں کے نیلم، مرجاں،
جگ مگ جگ مگ، رخشاں رخشاں،
جو دیکھنا چاہے پردیسی
پاس آئے دیکھے جی بھر کر
یہ زیست کی رانی کا جھومر
یہ امن کی دیوی کا کنگن!"

اگست ۱۹۵۲ء

روشن کہیں بہار کے اِمکان ہوئے تو ہیں
گلشن میں چاک چند گریباں ہوئے تو ہیں

اب بھی خزاں کا راج ہے لیکن کہیں کہیں
گوشے رہِ چمن میں غزلخواں ہوئے تو ہیں

ٹھہری ہوئی ہے شب کی سیاہی وہیں مگر
کچھ کچھ سحر کے رنگ پرافشاں ہوئے تو ہیں

ان میں لہو جلا ہو ہمارا، کہ جان و دل
محفل میں کچھ چراغ فروزاں ہوئے تو ہیں

ہاں کج کرو کلاہ کہ سب کچھ لٹا کے ہم
اب بے نیازِ گردشِ دوراں ہوئے تو ہیں

اہلِ قفس کی صبحِ چمن میں کھُلے گی آنکھ
بادِ صبا سے وعدہ و پیماں ہوئے تو ہیں
ہے دشت اب بھی دشت، مگر خونِ پا سے فیضؔ
سیراب چند خارِ مغیلاں ہوئے تو ہیں!

نثار میں تری گلیوں کے....

نثار میں تری گلیوں کے اے وطن کہ جہاں
چلی ہے رسم کہ کوئی نہ سر اُٹھا کے چلے
جو کوئی چاہنے والا طواف کو نکلے
نظر چُرا کے چلے جسم و جاں بچا کے چلے

ہے اہلِ دل کے لیے اب یہ نظمِ بست و کشاد
کہ سنگ و خشت مُقید ہیں اور سگ آزاد

بہت ہے ظلم کے دستِ بہانہ جُو کے لیے
جو چند اہلِ جنوں تیرے نام لیوا ہیں
بنے ہیں اہلِ ہوس مدعی بھی مُنصف بھی
کسے وکیل کریں کس سے مُنصفی چاہیں

مگر گزارنے والوں کے دن گزرتے ہیں
ترے فراق میں یوں صبح و شام کرتے ہیں

بُجھا جو روزنِ زنداں تو دِل یہ سمجھا ہے
کہ تیری مانگ ستاروں سے بھر گئی ہوگی
چمک اُٹھے ہیں سلاسل تو ہم نے جانا ہے
کہ اب سحر ترے رُخ پر بکھر گئی ہوگی

غرض تصوّرِ شام و سحر میں جیتے ہیں
گرفتِ سایۂ دیوار و در میں جیتے ہیں

یونہی ہمیشہ اُلجھتی رہی ہے ظلم سے خلق
نہ اُن کی رسم نئی ہے نہ اپنی رِیت نئی
یونہی ہمیشہ کھلائے ہیں ہم نے آگ میں پھُول
نہ اُن کی ہار نئی ہے نہ اپنی جیت نئی

اِسی سبب سے فلک کا گِلہ نہیں کرتے
ترے فراق میں ہم دِل بُرا نہیں کرتے
گر آج تجھ سے جُدا ہیں تو کل بہم ہوں گے
یہ رات بھر کی جُدائی تو کوئی بات نہیں
گر آج اَوج پہ ہے طالعِ رقیب تو کیا
یہ چار دِن کی خُدائی تو کوئی بات نہیں
جو تجھ سے عہدِ وفا اُستوار رکھتے ہیں
علاجِ گردشِ لیل و نہار رکھتے ہیں

شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں

موتی ہو کہ شیشہ، جام کہ دُر
جو ٹوٹ گیا، سو ٹوٹ گیا
کب اشکوں سے جُڑ سکتا ہے
جو ٹوٹ گیا سو چھوٹ گیا
تم ناحق ٹکڑے چُن چُن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو
شاید کہ اِنھی ٹکڑوں میں کہیں
وہ ساغرِ دل ہے جس میں کبھی

صد ناز سے اُترا کرتی تھی
صہبائے غمِ جاناں کی پری
پھر دنیا والوں نے تم سے
یہ ساغر لے کے پھوڑ دیا
جو مے تھی بہا دی مٹی میں
مہمان کا شہپر توڑ دیا
یہ رنگیں ریزے ہیں شاید
اُن شوخ بلوریں سپنوں کے
تم مست جوانی میں جن سے
خلوت کو سجایا کرتے تھے
ناداری، دفتر، بھوک اور غم
اِن سپنوں سے ٹکراتے رہے

بے رحم تھا چونکہ پتھراؤ
یہ کانچ کے ڈھانچے کیا کرتے
یا شاید ان ذرّوں میں کہیں
موتی ہے تمہاری عزت کا
وہ جس سے تمہارے عجز پہ بھی
شمشاد قدوں نے رشک کیا
اس مال کی دُھن میں پھرتے تھے
تاجر بھی بہت، رہزن بھی کئی
ہے چور نگر، یاں مُفلس کی
گر جان بچی تو آن گئی
یہ ساغر شیشے، لعل و گہر
سالم ہوں تو قیمت پاتے ہیں

یوں ٹکڑے ٹکڑے ہوں تو فقط
چبھتے ہیں، لہو رُلواتے ہیں
تم ناحق شیشے چُن چُن کر
دامن میں چھپائے بیٹھے ہو
شیشوں کا مسیحا کوئی نہیں
کیا آس لگائے بیٹھے ہو
یادوں کے گریبانوں کے رفو
پر دل کی گزر کب ہوتی ہے
اِک بخیہ اُدھیڑا، ایک سیا
یوں عمر بسر کب ہوتی ہے
اس کارگہِ ہستی میں جہاں
یہ ساغر، شیشے ڈھلتے ہیں

ہر شے کا بدل مل سکتا ہے
سب دامن پُر ہو سکتے ہیں
جو ہاتھ بڑھے یاور ہے یہاں
جو آنکھ اٹھے، وہ بختاور
یاں دھن دولت کا انت نہیں
ہوں گھات میں ڈاکو لاکھ، مگر
کب لُوٹ جھپٹ سے ہستی کی
دوکانیں خالی ہوتی ہیں
یاں پربت پربت ہیرے ہیں
یاں ساگر ساگر موتی ہیں
کچھ لوگ ہیں جو اس دولت پر
پردے لٹکاتے پھرتے ہیں

ہر پربت کو، ہر ساگر کو
نیلام چڑھاتے پھرتے ہیں
کچھ وہ بھی ہیں جو لڑ بھڑ کر
یہ پردے نوچ گراتے ہیں
ہستی کے اُٹھائی گیروں کی
ہر چال اُلجھائے جاتے ہیں
ان دونوں میں رن پڑتا ہے
نت بستی بستی، نگر نگر
ہر بستے گھر کے سینے میں
ہر چلتی راہ کے ماتھے پر
یہ کالک بھرتے پھرتے ہیں
وہ جوت جگاتے رہتے ہیں

یہ آگ لگاتے پھرتے ہیں
وہ آگ بجھاتے پھرتے ہیں
سب ساغر، شیشے، لعل و گہر
اس بازی میں بد جاتے ہیں
اُٹھو سب خالی ہاتھوں کو
اِس رَن سے بلاوے آتے ہیں

زنداں کی ایک شام

شام کے پیچ و خم ستاروں سے
زینہ زینہ اُتر رہی ہے رات
یوں صبا پاس سے گزرتی ہے
جیسے کہہ دی کسی نے پیار کی بات
صحنِ زنداں کے بے وطن اشجار
سرنگوں، محو ہیں بنانے میں
دامنِ آسماں پہ نقش و نگار
شانۂ بام پر دمکتا ہے
مہرباں چاندنی کا دستِ جمیل
خاک میں گھل گئی ہے آبِ نجوم

نور میں گھل گیا ہے عرش کا نیل

سبز گوشوں میں نیلگوں سائے

لہلہاتے ہیں جس طرح دل میں

موجِ دردِ فراقِ یار آئے۔

دل سے پیہم خیال کہتا ہے

اتنی شیریں ہے زندگی اس پل

ظلم کا زہر گھولنے والے

کامراں ہو سکیں گے آج نہ کل

جلوہ گاہِ وصال کی شمعیں

وہ بجھا بھی چکے اگر تو کیا

چاند کو گل کریں تو ہم جانیں!

زنداں کی ایک صبح

رات باقی تھی ابھی جب سرِ بالیں آ کر
چاند نے مجھ سے کہا "جاگ سحر آئی ہے
جاگ اِس شب جو مے خواب ترا حصّہ تھی
جام کے لب سے تہِ جام اُتر آئی ہے"
عکسِ جاناں کو وِداع کر کے اُٹھی میری نظر
شب کے ٹھہرے ہوئے پانی کی سیہ چادر پر
جا بجا رقص میں آنے لگے چاندی کے بھنور
چاند کے ہاتھ سے تاروں کے کنول گر گر کر
ڈوبتے، تیرتے، مرجھاتے رہے، کھلتے رہے
رات اور صبح بہت دیر گلے ملتے رہے

صحنِ زنداں میں رفیقوں کے سنہرے چہرے
سطحِ ظُلمت سے دمکتے ہوئے اُبھرے کم کم
نیند کی اوس نے ان چہروں سے دھو ڈالا تھا
دیس کا درد، فراقِ رُخِ محبوب کا غم
دُور نوبت ہوئی، پھرنے لگے بیزار قدم
زرد، فاقوں کے ستائے ہوئے پہرے والے
اہلِ زنداں کے غضبناک، خروشاں نالے
جن کی باہوں میں پھرا کرتے ہیں باہیں ڈالے
لذّتِ خواب سے مخمور ہوائیں جاگیں
جیل کی زہر بھری چُور صدائیں جاگیں
دُور دروازہ کھُلا کوئی، کوئی بند ہوا
دُور مچلی کوئی زنجیر، مچل کے روئی

ڈور اُترا کسی تارے کے جگر میں خنجر
سر پٹکنے لگا رہ رہ کے دریچہ کوئی
گویا پھر خواب سے بیدار ہوئے دشمنِ جاں
سنگ و فولاد سے ڈھالے ہوئے جنّاتِ گراں
جن کے چنگل میں شب و روز ہیں فریاد کناں
میرے بیکار شب و روز کی نازک پریاں
اپنے شہپور کی رہ دیکھ رہی ہیں یہ اسیر
جس کے ترکش میں ہیں اُمید کے جلتے ہوئے تیر۔

یاد

دشتِ تنہائی میں اے جانِ جہاں لرزاں ہیں

تیری آواز کے سائے، ترے ہونٹوں کے سراب

دشتِ تنہائی میں، دُوری کے خس و خاک تلے

کِھل رہے ہیں، ترے پہلو کے سمن اور گلاب

اُٹھ رہی ہے کہیں قُربت سے تری سانس کی آنچ

اپنی خوشبو میں سلگتی ہوئی مدھم مدھم

دُور اُفق پار، چمکتی ہوئی قطرہ قطرہ

گِر رہی ہے تری دلدار نظر کی شبنم

اس قدر پیار سے اے جانِ جہاں رکھا ہے

دِل کے رخسار پر اس وقت تری یاد نے ہات

یوں گماں ہوتا ہے گرچہ ہے ابھی صبحِ فراق
ڈھل گیا ہجر کا دن، آ بھی گئی وصل کی رات

اے حبیبِ عنبر دست!

ایک اجنبی خاتون کے نام

خوشبو کا تحفہ وصول ہونے پر

کسی کے دستِ عنایت نے کُنجِ زنداں میں
کیا ہے آج عجب دل نواز بندوبست
مہک رہی ہے فضا زلفِ یار کی صورت
ہوا ہے گرمیِ خوشبو سے اس طرح سرمست
ابھی ابھی کوئی گزرا ہے گُل بدن گویا
کہیں قریب سے گیسو بدوش غنچہ بدست
لیے ہے بوئے رفاقت اگر ہوائے چمن
تو لاکھ پہرے بٹھائیں قفس پہ ظلم پرست

ہمیشہ سبز رہے گی وہ شاخِ مہر و وفا
کہ جس کے ساتھ بندھی ہے دلوں کی فتح و شکست

یہ شعرِ حافظِ شیراز، اے صبا! کہنا
ملے جو تجھ سے کہیں وہ حبیبِ عنبر دست

"خلل پذیر بوَد ہر بنا کہ مے بینی
بجز بنائے محبت کہ خالی از خلل است"

سنٹرل جیل۔ حیدرآباد
۲۸-۲۹- اپریل ۵۳ء

ملاقات

یہ رات اُس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے، تجھ سے عظیم تر ہے

عظیم تر ہے کہ اس کی شاخوں
میں لاکھ مشعل بکف ستاروں
کے کارواں، گھِر کے کھو گئے ہیں
ہزار مہتاب، اس کے سائے
میں اپنا سب نُور رو گئے ہیں
یہ رات اُس درد کا شجر ہے
جو مجھ سے تجھ سے عظیم تر ہے

مگر اِسی رات کے شجر سے
یہ چند لمحوں کے زرد پتے
گرے ہیں، اور تیرے گیسوؤں میں
اُلجھ کے گلنار ہو گئے ہیں
اِسی کی شبنم سے خامشی کے
یہ چند قطرے، تری جبیں پر
برس کے موتی پرو گئے ہیں

۲ بہت سیہ ہے یہ رات لیکن
اِسی سیاہی میں رُونما ہے
وہ نہرِ خوں جو مری صدا ہے
اِسی کے سائے میں نُور گر ہے
وہ موجِ زر جو تری نظر ہے

وہ غم جو اس وقت تیری باہوں
کے گلستاں میں سُلگ رہا ہے
(وہ غم جو اس رات کا ثمر ہے)
کچھ اور تپ جائے اپنی آہوں
کی آنچ میں تو یہی شرر ہے
ہر اک سیہ شاخ کی کماں سے
جگر میں ٹوٹے ہیں تیر جتنے
جگر سے نوچے ہیں، اور ہر اک
کا ہم نے تیشہ بنا لیا ہے

۳ الم نصیبوں، جگر فگاروں
کی صبح افلاک پر نہیں ہے

جہاں پہ ہم تم کھڑے ہیں دونوں
سحر کا روشن اُفق یہیں ہے
یہیں پہ غم کے شرار کھل کر
شفق کا گلزار بن گئے ہیں
یہیں پہ قاتل دُکھوں کے تیشے
قطار اندر قطار کرنوں
کے آتشیں ہار بن گئے ہیں
یہ غم جو اس رات نے دیا ہے
یہ غم سحر کا یقیں بنا ہے
یقیں جو غم سے کریم تر ہے
سحر جو شب سے عظیم تر ہے

منٹگمری جیل
۱۲-اکتوبر ۳۰-نومبر ۵۴ء

واسوخت

سچ ہے ہمیں کو آپ کے شکوے بجا نہ تھے
بے شک ستم جناب کے سب دوستانہ تھے

ہاں، جو جفا بھی آپ نے کی قاعدے سے کی
ہاں، ہم ہی کاربندِ اصولِ وفا نہ تھے

آئے تو یوں کہ جیسے ہمیشہ تھے مہرباں
بھولے تو یوں کہ جیسے کبھی آشنا نہ تھے

کیوں دادِ غم ہمیں نے طلب کی، بُرا کیا
ہم سے جہاں میں کُشتۂ غم اور کیا نہ تھے

گر فکرِ زخم کی تو خطاوار ہیں کہ ہم
کیوں محوِ مدحِ خوبیِ تیغِ ادا نہ تھے

ہر چارہ گر کو چارہ گری سے گریز تھا
ورنہ ہمیں جو دُکھ تھے، بہت لادوا نہ تھے

لب پر ہے تلخیِ مےِ ایام ، ورنہ فیضؔ
ہم تلخیِ کلام پہ مائل ذرا نہ تھے

منٹگمری جیل
۲۳-نومبر ۵۳ء

اے رَوشنیوں کے شہر!

سبزہ سبزہ، سُوکھ رہی ہے پھیکی، زرد دوپہر
دیواروں کو چاٹ رہا ہے تنہائی کا زہر
دُور افق تک گھٹتی، بڑھتی، اُٹھتی، گرتی رہتی ہے
کُہر کی صورت بے رونق دردوں کی گدلی لہر
بستا ہے اس کُہر کے پیچھے روشنیوں کا شہر

اے روشنیوں کے شہر!

کون کہے کس سمت ہے تیری روشنیوں کی راہ
ہر جانب بے نُور کھڑی ہے ہجر کی شہر پناہ
تھک کر ہر سُو بیٹھ رہی ہے شوق کی ماند سپاہ

HaSnain Sialvi

آج مرا دل فکر میں ہے

اے روشنیوں کے شہر

شب خوں سے منہ پھیر نہ جائے ارمانوں کی رَو

خیر ہو تیری لیلاؤں کی، ان سب سے کہہ دو

آج کی شب جب دیئے جلائیں، اونچی رکھیں لَو

لاہور جیل
منٹگمری جیل

۲۸- مارچ
۱۵- اپریل | ۵۴ء

HaSnain Sialvi

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

ایتھل اور جولیس روزنبرگ کے
خطوط سے متاثر ہو کر لکھی گئی

تیرے ہونٹوں کے پھولوں کی چاہت میں ہم
دار کی خشک ٹہنی پہ وارے گئے
تیرے ہاتوں کی شمعوں کی حسرت میں ہم
نیم تاریک راہوں میں مارے گئے

سُولیوں پر ہمارے لبوں سے پرے
تیرے ہونٹوں کی لالی لپکتی رہی
تیری زُلفوں کی مستی برستی رہی
تیرے ہاتھوں کی چاندی دمکتی رہی

جب گھُلی تیری راہوں میں شامِ ستم
ہم چلے آئے ، لائے جہاں تک قدم
لب پہ حرفِ غزل، دل میں قندیلِ غم
اپنا غم تھا گواہی ترے حسن کی
دیکھ قائم رہے اس گواہی پہ ہم
ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

نارسائی اگر اپنی تقدیر تھی
تیری اُلفت تو اپنی ہی تدبیر تھی
کس کو شکوہ ہے گر شوق کے سلسلے
ہجر کی قتل گاہوں سے سب جا ملے

قتل گاہوں سے چُن کر ہمارے عَلَم

اور نکلیں گے عُشّاق کے قافلے

جن کی راہِ طلب سے ہمارے قدم

مختصر کر چلے درد کے فاصلے

کر چلے جن کی خاطر جہاں گیر ہم

جاں گنوا کر تری دلبری کا بھرم

ہم جو تاریک راہوں میں مارے گئے

منٹگمری جیل

۱۵-مئی ۵۴ء

دریچہ

گڑی ہیں کتنی صلیبیں مرے دریچے میں
ہر ایک اپنے مسیحا کے خون کا رنگ لیے
ہر ایک وصلِ خداوند کی اُمنگ لیے
کسی پہ کرتے ہیں ابرِ بہار کو قرباں
کسی پہ قتل مہِ تابناک کرتے ہیں
کسی پہ ہوتی ہے سرمست شاخسار دونیم
کسی پہ بادِ صبا کو ہلاک کرتے ہیں

ہر آئے دن یہ خداوندگانِ مہر و جمال
لہو میں غرق مرے غمکدے میں آتے ہیں

اور آئے دن مری نظروں کے سامنے اُنکے
شہید جسم سلامت اُٹھائے جاتے ہیں

منٹگمری جیل
دسمبر ۵۴ء

درد آئے گا دبے پاؤں

اور کچھ دیر میں، جب پھر مرے تنہا دل کو
فکر آ لے گی کہ تنہائی کا کیا چارہ کرے
درد آئے گا دبے پاؤں، لیے سرخ چراغ
وہ جو اک درد دھڑکتا ہے کہیں دل سے پرے
شعلۂ درد جو پہلو میں لپک اُٹھے گا
دل کی دیوار پہ ہر نقش دمک اُٹھے گا

حلقۂ زلف کہیں، گوشۂ رخسار کہیں
ہجر کا دشت کہیں، گلشنِ دیدار کہیں
لطف کی بات کہیں، پیار کا اقرار کہیں

دل سے پھر ہوگی مری بات کہ اے دل اے دل!

یہ جو محبوب بنا ہے تری تنہائی کا

یہ تو مہماں ہے گھڑی بھر کا، چلا جائے گا

اس سے کب تیری مصیبت کا مداوا ہوگا

مُشتعِل ہو کے ابھی اُٹھیں گے وحشی سائے

یہ چلا جائے گا، رہ جائیں گے باقی سائے

رات بھر جن سے ترا خون خرابا ہوگا

جنگ ٹھہری ہے کوئی کھیل نہیں ہے اے دل!

دشمنِ جاں ہیں سبھی، سارے کے سارے قاتل

یہ کڑی رات بھی، یہ سائے بھی، تنہائی بھی

درد اور جنگ میں کچھ میل نہیں ہے اے دل!

لاؤ، سلگاؤ کوئی جوشِ غضب کا انگار
طیش کی آتشِ جرار کہاں ہے، لاؤ
وہ دہکتا ہوا گلزار کہاں ہے، لاؤ
جس میں گرمی بھی ہے، حرکت بھی، توانائی بھی
ہو نہ ہو اپنے قبیلے کا بھی کوئی لشکر
منتظر ہوگا اندھیرے کی فصیلوں کے اُدھر
اُن کو شعلوں کے رجز اپنا پتا تو دیں گے
خیر، ہم تک وہ نہ پہنچیں بھی، صدا تو دیں گے
دُور کتنی ہے ابھی صبح، بتا تو دیں گے۔

منٹگمری جیل
یکم دسمبر ۵۴ء

"آجاؤ افریقا!"٭

(ایک جز)

آجاؤ، میں نے سن لی ترے ڈھول کی ترنگ
آجاؤ، مست ہو گئی میرے لہو کی تال
"آجاؤ افریقا!"

آجاؤ، میں نے دھول سے ماتھا اٹھا لیا
آجاؤ، میں نے چھیل دی آنکھوں سے غم کی چھال
آجاؤ، میں نے درد سے بازو چھڑا لیا
آجاؤ، میں نے نوچ دیا بے کسی کا جال
"آجاؤ افریقا!"

پنجے میں ہتھکڑی کی کڑی بن گئی ہے گرز
گردن کا طوق توڑ کے ڈھالی ہے میں نے ڈھال

٭ افریقی حریت پسندوں کا نعرہ

"آجاؤ ایفریقا!"

جلتے ہیں ہر کچھار میں بھالوں کے مرگ نین

دشمن لہو سے رات کی کالک ہوئی ہے لال

"آجاؤ ایفریقا!"

دھرتی دھڑک رہی ہے میرے ساتھ ایفریقا

دریا تھرک رہا ہے تو بَن دے رہا ہے تال

میں ایفریقا ہوں، دھار لیا میں نے تیرا رُوپ

میں تُو ہوں، میری چال ہے تیری ببر کی چال

"آجاؤ ایفریقا!"

آؤ ببر کی چال

"آجاؤ ایفریقا!"

منٹگمری جیل

۱۴- جنوری ۵۵ء

یہ فصل اُمیدوں کی ہمدم

سب کاٹ دو
بِسمل پودوں کو
بے آب سِسکتے مت چھوڑو۔
سب نوچ لو
بیکل پھولوں کو
شاخوں پہ بِلکتے مت چھوڑو۔
یہ فصل اُمیدوں کی ہمدم
اِس بار بھی غارت جائے گی
سب محنت، صبحوں شاموں کی
اب کے بھی اکارت جائے گی

کھیتی کے کونوں کھدروں میں
پھر اپنے لہو کی کھاد بھرو
پھر مٹی سینچو اشکوں سے
پھر اگلی رت کی فکر کرو

پھر اگلی رت کی فکر کرو
جب پھر اک بار اجڑنا ہے
اک فصل پکی تو بھر پایا
جب تک تو یہی کچھ کرنا ہے

منٹگمری جیل
۳۰ مارچ ۵۵ء

بنیاد کچھ تو ہو

کوئے ستم کی خامشی آباد کچھ تو ہو
کچھ تو کہو ستم کشو، فریاد کچھ تو ہو
بیداد گر سے شکوۂ بیداد کچھ تو ہو
بولو، کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو

مرنے چلے تو سطوتِ قاتل کا خوف کیا
اتنا تو ہو کہ باندھنے پائے نہ دست و پا
مقتل میں کچھ تو رنگ جمے جشنِ رقص کا
رنگیں لہو سے پنجۂ صیاد کچھ تو ہو
خوں پر گواہ دامنِ جلاد کچھ تو ہو
جب خوں بہا طلب کریں بنیاد کچھ تو ہو

گر تن نہیں، زباں سہی، آزاد کچھ تو ہو
دُشنام، نالہ، ہاؤ ہو، فریاد کچھ تو ہو
چیخے ہے درد، اے دلِ برباد کچھ تو ہو
بولو کہ شورِ حشر کی ایجاد کچھ تو ہو
بولو کہ روزِ عدل کی بنیاد کچھ تو ہو

منٹگمری جیل
۱۲، اپریل ۵۵ء

کوئی عاشق کسی محبوبہ سے!

یاد کی راہگزر جس پہ اِسی صورت سے
مدتیں بیت گئی ہیں تمہیں چلتے چلتے
ختم ہو جائے جو دو چار قدم اور چلو
موڑ پڑتا ہے جہاں دشتِ فراموشی کا
جس سے آگے نہ کوئی میں ہوں کوئی تم ہو
سانس تھامے ہیں نگاہیں کہ نہ جانے کس دم
تم پلٹ آؤ، گزر جاؤ، کہ مڑ کر دیکھو
گرچہ واقف ہیں نگاہیں کہ یہ سب دھوکا ہے
گر کہیں تم سے ہم آغوش ہوئی پھر سے نظر
پھوٹ نکلے گی وہاں اور کوئی راہگزر

پھر اسی طرح جہاں ہوگا مقابل پیہم

سایۂ زلف کا اور جنبشِ بازو کا سفر

دوسری بات بھی جھوٹی ہے کہ دل جانتا ہے

یاں کوئی موڑ کوئی دشت کوئی گھات نہیں

جس کے پردے میں مرا ماہِ رواں ڈوب سکے

تم سے چلتی رہے یہ راہ، یونہی اچھا ہے

تم نے مڑ کر بھی نہ دیکھا تو کوئی بات نہیں

اگست ۵۵ء

شہر میں چاکِ گریباں ہوئے ناپید اب کے
کوئی کرتا ہی نہیں ضبط کی تاکید اب کے

لطف کر، اے نگہِ یار کہ غم والوں نے
حسرتِ دل کی اُٹھائی نہیں تمہید اب کے

چاند دیکھا تری آنکھوں میں، نہ ہونٹوں پہ شفق
ملتی جُلتی ہے شبِ غم سے تری دید اب کے

دِل دُکھا ہے نہ وہ پہلا سا، نہ جاں تڑپی ہے
ہم ہی غافل تھے کہ آئی ہی نہیں عید اب کے

پھر سے بُجھ جائیں گی شمعیں جو ہوا تیز چلی
لا کے رکھو سرِ محفل کوئی خورشید اب کے

کراچی ۱۳-اگست ۵۵ء

یوں بہار آئی ہے اس بار کہ جیسے قاصد
کوچۂ یار سے بے نیلِ مرام آتا ہے

ہر کوئی شہر میں پھرتا ہے سلامت دامن
رند میخانے سے شائستہ خرام آتا ہے

ہوسِ مطرب و ساقی میں پریشاں اکثر
ابر آتا ہے کبھی ماہِ تمام آتا ہے

شوق والوں کی حزیں محفلِ شب میں اب بھی
آمدِ صبح کی صورت ترا نام آتا ہے

اب بھی اعلانِ سحر کرتا ہوا مست کوئی
داغِ دل کر کے فروزاں سرِ شام آتا ہے

لاہور۔ مارچ ۵۶ء

ناتمام

سرِآغاز

شاید کبھی اِفشا ہو نگاہوں پہ تمہاری
ہر سادہ ورق جس سخنِ کُشتہ سے خوں ہے
شاید کبھی اس گیت کا پرچم ہو سرافراز
جو آمدِ صرصر کی تمنا میں نگوں ہے
شاید کبھی اس دل کی کوئی رگ تمہیں چُبھ جائے
جو سنگِ سرِ راہ کی مانند زبوں ہے

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے ہیں مزید اس طرح کی شان دار، مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884
سدرہ طاہر : 03340120123
حسنین سیالوی : 03056406067

دستِ تہِ سنگ آمدہ

بیزار فضا، درپئے آزارِ صبا ہے
یوں ہے کہ ہر اک ہمدمِ دیرینہ خفا ہے

ہاں بادہ کشو آیا ہے اب رنگ پہ موسم
اب سیر کے قابل روشِ آب و ہوا ہے

اُمڈی ہے ہر اک سمت سے الزام کی برسات
چھائی ہوئی ہر دانگ ملامت کی گھٹا ہے

وہ چیز بھری ہے کہ سلگتی ہے صراحی
ہر کاسۂ مے زہرِ ہلاہل سے سوا ہے

ہاں جام اُٹھاؤ کہ بیادِ لبِ شیریں
یہ زہر تو یاروں نے کئی بار پیا ہے

اِس جذبۂ دل کی نہ سزا ہے نہ جزا ہے

مقصودِ رہِ شوق وفا ہے نہ جفا ہے

احساسِ غمِ دل جو غمِ دل کا صِلا ہے

اُس حُسن کا اِحساس ہے جو تیری عطا ہے

ہر صبحِ گلستاں ہے ترا روئے بہاریں

ہر پھول تری یاد کا نقشِ کفِ پا ہے

ہر بھیگی ہوئی رات تیری زلف کی شبنم

ڈھلتا ہوا سُورج ترے ہونٹوں کی فضا ہے

ہر راہ پہنچتی ہے تری چاہ کے در تک

ہر حرفِ تمنّا ترے قدموں کی صدا ہے

تعزیرِ سیاست ہے نہ غیروں کی خطا ہے

وہ ظلم جو ہم نے دلِ وحشی پہ کیا ہے

زندانِ رہِ یار میں پابند ہوئے ہم
زنجیر بکف ہے نہ کوئی بند بپا ہے
مجبوری و دعوئ گرفتاریِ اُلفت
دستِ تہِ سنگ آمدہ پیمانِ وفا ہے

سفرنامہ پیکنگ

یوں گماں ہوتا ہے بازو ہیں مرے ساٹھ کروڑ
اور آفاق کی حد تک مرے تن کی حد ہے
دل مرا کوہ و دمن دشت و چمن کی حد ہے
میرے کیسے میں ہے راتوں کا سیاہ فام جلال
میرے ہاتھوں میں ہے صبحوں کی عنانِ گلگوں
میری آغوش میں پلتی ہے خدائی ساری
میرے مقدور میں ہے معجزۂ کُن فَیَکُون

سنکیانگ

اب کوئی طبل بجے گا، نہ کوئی شاہسوار
صُبحدم موت کی وادی کو روانہ ہو گا!

اب کوئی جنگ نہ ہوگی نہ کبھی رات گئے

خون کی آگ کو اشکوں سے بجھانا ہوگا

کوئی دل دھڑکے گا شب بھر نہ کسی آنگن میں

وہم منحوس پرندے کی طرح آئے گا

سہم، خونخوار درندے کی طرح آئے گا

اب کوئی جنگ نہ ہوگی، مے و ساغر لاؤ

خوں لٹانا نہ کبھی اشک بہانا ہوگا

ساقیا! رقص کوئی رقصِ صبا کی صورت

مطربا! کوئی غزل رنگِ حنا کی صورت

جشن کا دن

جنوں کی یاد مناؤ کہ جشن کا دن ہے
صلیب و دار سجاؤ کہ جشن کا دن ہے

طرب کی بزم ہے بدلو دلوں کے پیراہن
جگر کے چاک سِلاؤ کہ جشن کا دن ہے

تُنک مزاج ہے ساقی نہ رنگِ مے دیکھو
بھرے جو شیشہ، چڑھاؤ کہ جشن کا دن ہے

تمیزِ رہبر و رہزن کرو نہ آج کے دن
ہر اِک سے ہاتھ مِلاؤ کہ جشن کا دن ہے

ہے انتظارِ ملامت میں ناصحوں کا ہجوم
نظر سنبھال کے جاؤ کہ جشن کا دن ہے

وہ شورشِ غمِ دل جس کی لے نہیں کوئی
غزل کی دھن میں سناؤ کہ جشن کا دن ہے

مارچ ۱۹۵۷ء

شام

اس طرح ہے کہ ہر اک پیڑ کوئی مندر ہے
کوئی اُجڑا ہوا، بے نُور پُرانا مندر
ڈھونڈتا ہے جو خرابی کے بہانے کب سے
چاک ہر بام، ہر اک در کا دمِ آخر ہے
آسماں کوئی پروہت ہے جو ہر بام تلے
جسم پر راکھ ملے، ماتھے پہ سیندور ملے
سرنگوں بیٹھا ہے چپ چاپ نہ جانے کب سے
اس طرح ہے کہ پسِ پردہ کوئی ساحر ہے
جس نے آفاق پہ پھیلایا ہے یوں سحر کا دام
دامنِ وقت سے پیوست ہے یوں دامنِ شام

اب کبھی شام بجھے گی نہ اندھیرا ہو گا
اب کبھی رات ڈھلے گی نہ سویرا ہو گا

آسماں آس لیے ہے کہ یہ جادو ٹوٹے
چپ کی زنجیر کٹے، وقت کا دامن چھوٹے
دے کوئی سنکھ دہائی، کوئی پایل بولے
کوئی بت جاگے، کوئی سانولی گھونگھٹ کھولے

تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارہ نہیں

تم یہ کہتے ہو وہ جنگ ، ہو بھی چکی
جس میں رکھا نہیں ہے کسی نے قدم
کوئی اُترا نہ میداں میں، دشمن نہ ہم
کوئی صف بن نہ پائی ، نہ کوئی عَلَم
منتشر دوستوں کو صدا دے سکا
اجنبی دشمنوں کا پتا دے سکا
تم یہ کہتے ہو وہ جنگ ہو بھی چکی
جس میں رکھا نہیں ہم نے اب تک قدم
تم یہ کہتے ہو اب کوئی چارا نہیں
جسم خستہ ہے ہاتھوں میں یارا نہیں

اپنے بس کا نہیں بارِ سنگِ ستم

بارِ سنگِ ستم، بارِ کہسارِ غم

جس کو چھو کر سبھی اک طرف ہو گئے

بات کی بات میں ذی شرف ہو گئے

دوستو، کوئے جاناں کی نامہرباں

خاک پر اپنے روشن لہو کی بہار

اب نہ آئے گی کیا؟ اب کھلے گا نہ کیا

اس کفِ نازنیں پر کوئی لالہ زار؟

اس حزیں خامشی میں نہ لوٹے گا کیا

شورِ آوازِ حق، نعرۂ گیر و دار

شوق کا امتحاں جو ہوا سو ہوا

جسم و جاں کا زیاں جو ہوا سو ہوا!

سود سے پیشتر ہے زیاں اور بھی
دوستو، ماتمِ جسم و جاں اور بھی
اور بھی تلخ تر امتحاں، اور بھی

جنوری ۱۹۵۸ء

شورشِ زنجیر بسم اللہ

ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ
ہر اک جانب مچا کہرامِ دار و گیر بسم اللہ
گلی کوچوں میں بکھری شورشِ زنجیر بسم اللہ

درِ زنداں پہ بُلوائے گئے پھر سے جنوں والے
دریدہ دامنوں والے پریشاں گیسوؤں والے
جہاں میں دردِ دل کی پھر ہوئی توقیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ

گِنو سب داغ دل کے حسرتیں شوقیں نگاہوں کی
سرِ دربار پُرسش ہو رہی ہے پھر گناہوں کی
کرو یارو شمارِ نالۂ شبگیر بسم اللہ

ستم کی داستاں، کشتہ دِلوں کا ماجرا کہیے
جو زیرِ لب نہ کہتے تھے وہ سب کچھ برملا کہیے
مُصر ہے مُحتسب رازِ شہیدانِ وفا کہیے
لگی ہے حرفِ ناگفتہ پہ اب تعزیر بسم اللہ
سرِ مقتل چلو بے زحمتِ تقصیر بسم اللہ
ہوئی پھر امتحانِ عشق کی تدبیر بسم اللہ

لاہور جیل
جنوری ۱۹۵۹ء

آج بازار میں پابجولاں چلو

چشمِ نم ، جانِ شوریدہ کافی نہیں
تہمتِ عشق پوشیدہ کافی نہیں
آج بازار میں پا بجولاں چلو

دست افشاں چلو، مست و رقصاں چلو
خاک بر سر چلو، خوں بداماں چلو
راہ تکتا ہے سب شہرِ جاناں چلو

حاکمِ شہر بھی ، مجمعِ عام بھی
تیرِ الزام بھی ، سنگِ دشنام بھی
صبحِ ناشاد بھی ، روزِ ناکام بھی

اِن کا دم ساز اپنے سوا کون ہے

شہرِ جاناں میں اب باصفا کون ہے

دستِ قاتل کے شایاں رہا کون ہے

رختِ دل باندھ لو، دل فگارو چلو

پھر ہمیں قتل ہو آئیں یارو چلو

لاہور جیل

۱۱- فروری ۱۹۵۹ء

قیدِ تنہائی

دُور آفاق پہ لہرائی کوئی نُور کی لہر
خواب ہی خواب میں بیدار ہوا درد کا شہر
خواب ہی خواب میں بیتاب نظر ہونے لگی
عدم آبادِ جدائی میں سحر ہونے لگی
کاسۂ دل میں بھری اپنی صبوحی میں نے
گھول کر تلخیِ دیروز میں اِمروز کا زہر
دُور آفاق پہ لہرائی کوئی نُور کی لہر
آنکھ سے دُور کسی صبح کی تمہید لیے
کوئی نغمہ، کوئی خوشبو، کوئی کافر صُورت
عدم آبادِ جدائی میں مسافر صُورت

بے خبر گزری، پریشانیِ اُمّید لیے
گھول کر تلخیِ دیروز میں امروز کا زہر
حسرتِ روزِ ملاقات رقم کی میں نے
دیس پردیس کے یارانِ قدح خوار کے نام
حُسنِ آفاق، جمالِ لب و رخسار کے نام

زندانِ قلعہ لاہور
مارچ ۱۹۵۹ء

حمد

ملکۂ شہرِ زندگی تیرا
شکر کس طور سے ادا کیجے
دولتِ دل کا کچھ شمار نہیں
تنگدستی کا کیا گلا کیجے۔
جو ترے حسن کے فقیر ہوئے
ان کو تشویشِ روزگار کہاں
درد بیچیں گے گیت گائیں گے
اس سے خوش وقت کاروبار کہاں؟
جام چھلکا تو جم گئی محفل
مِنّتِ لطفِ غمگسار کسے

اشک ٹپکا تو کھل گیا گلشن
رنج کم ظرفیِ بہار گئے
خوش نشیں ہیں کہ چشم دل کی مراد
دیر میں ہے نہ خانقاہ میں ہے
ہم کہاں قسمت آزمانے جائیں
ہر صنم اپنی بارگاہ میں ہے
کون ایسا غنی ہے جس سے کوئی
نقدِ شمس و قمر کی بات کرے
جس کو شوقِ نبرد ہو ہم سے
جائے تسخیرِ کائنات کرے

جون ۱۹۵۹ء

مُلاقات مری

ساری دیوار سیہ ہو گئی تا حلقۂ بام
راستے بجھ گئے رخصت ہوئے رہگیر تمام
اپنی تنہائی سے گویا ہوئی پھر رات مری
ہو نہ ہو آج پھر آئی ہے مُلاقات مری
اِک ہتھیلی پہ حِنا، ایک ہتھیلی پہ لہو
اک نظر زہر لیے ایک نظر میں دارُو
دیر سے منزلِ دل میں کوئی آیا نہ گیا
فرقتِ درد میں بے آب ہوا تختۂ داغ
کس سے کہیے کہ بھرے رنگ سے زخموں کے ایاغ
اور پھر خود ہی چلی آئی ملاقات مری

آشنا موت جو دشمن بھی ہے غمخوار بھی ہے
وہ جو ہم لوگوں کی قاتل بھی ہے دلدار بھی ہے

ختم ہوئی بارشِ سنگ

ناگہاں آج مرے تارِ نظر سے کٹ کر
ٹکڑے ٹکڑے ہوئے آفاق پہ خورشید و قمر
اب کسی سمت اندھیرا نہ اُجالا ہو گا
بُجھ گئی دل کی طرح راہِ وفا میرے بعد
دوستو! قافلۂ درد کا اب کیا ہو گا
اب کوئی اور کرے پرورشِ گلشنِ غم
دوستو ختم ہوئی دیدۂ تر کی شبنم
تھم گیا شورِ جنوں ختم ہوئی بارشِ سنگ
خاکِ رہ آج لیے ہے لبِ دلدار کا رنگ

کوئے جاناں میں کھلا میرے لہو کا پرچم
دیکھیے دیتے ہیں کس کس کو صدا میرے بعد

کون ہوتا ہے حریفِ مئے مرد افگنِ عشق
ہے مکرر لبِ ساقی پہ صلا میرے بعد

نومبر ۱۹۶۰ء

کہاں جاؤ گے

اور کچھ دیر میں لُٹ جائے گا ہر بام پہ چاند
عکس کھو جائیں گے آئینے ترس جائیں گے
عرش کے دیدۂ نمناک سے باری باری
سب ستارے سرِ خاشاک برس جائیں گے
آس کے مارے تھکے ہارے شبستانوں میں
اپنی تنہائی سمیٹے گا، بچھائے گا کوئی
بے وفائی کی گھڑی، ترکِ مدارات کا وقت
اِس گھڑی اپنے سوا یاد نہ آئے گا کوئی
ترکِ دنیا کا سماں، ختمِ ملاقات کا وقت
اِس گھڑی اے دلِ آوارہ کہاں جاؤ گے

اس گھڑی کوئی کسی کا بھی نہیں رہنے دو
کوئی اِس وقت ملے گا ہی نہیں رہنے دو
اور ملے گا بھی تو اِس طور کہ پچھتاؤ گے
اِس گھڑی اے دلِ آوارہ کہاں جاؤ گے
اور کچھ دیر ٹھہر جاؤ کہ پھر نشترِ صبح
زخم کی طرح ہر اک آنکھ کو بیدار کرے
اور ہر کشتۂ واماندگیِ آخرِ شب
بھول کر ساعتِ درماندگیِ آخرِ شب
جان پہچان ملاقات پہ اصرار کرے

دسمبر ۱۹۶۱ء

شہرِ یاراں

آسماں کی گود میں دم توڑتا ہے طفلِ ابر

جم رہا ہے ابر کے ہونٹوں پہ خوں آلود کف

بجھتے بجھتے بجھ گئی ہے عرش کے حجروں میں آگ

دھیرے دھیرے بچھ رہی ہے ماتمی تاروں کی صف

اے صبا شاید ترے ہمراہ یہ خوں ناک شام

سر جھکائے جا رہی ہے شہرِ یاراں کی طرف

شہرِ یاراں جس میں اس دم ڈھونڈتی پھرتی ہے موت

شیر دل بانکوں میں اپنے تیر و نشتر کے ہدف

اِک طرف بجتی ہیں جوشِ زیست کی شہنائیاں

اک طرف چنگھاڑتے ہیں اہرمن کے طبل و دف

جا کے کہنا اے صبا، بعد از سلامِ دوستی

آج شب جس دم گزر ہو شہرِ یاراں کی طرف

دشتِ شب میں اس گھڑی چپ چاپ ہے شاید رواں

ساقیِ صبحِ طرب، نغمہ بلب، ساغر بکف

وہ پہنچ جائے تو ہوگی پھر سے برپا انجمن

اور ترتیبِ مقام و منصب و جاہ و شرف

خوشا ضمانتِ غم

دیارِ یار تری جوششِ جنوں پہ سلام
مرے وطن ترے دامانِ تار تار کی خیر
رہِ یقین تری افشانِ خاک و خوں پہ سلام
مرے چمن ترے زخموں کے لالہ زار کی خیر
ہر ایک خانۂ ویراں کی تیرگی پہ سلام
ہر ایک خاک بسر، خانماں خراب کی خیر
ہر ایک کشتۂ ناحق کی خامشی پہ سلام
ہر ایک دیدۂ پُرنم کی آب و تاب کی خیر
رواں رہے یہ روایت خوشا ضمانتِ غم
نشاطِ ختمِ غمِ کائنات سے پہلے

ہر اک کے ساتھ رہے دولتِ امانتِ غم
کوئی نجات نہ پائے نجات سے پہلے
سکوں ملے نہ کبھی تیرے پافگاروں کو
جمالِ خونِ سرِ خار کو نظر نہ لگے
اماں ملے نہ کہیں تیرے جاں نثاروں کو
جلالِ فرقِ سرِ دار کو نظر نہ لگے

لندن ۱۹۶۳ء

جب تیری سمندر آنکھوں میں

یہ دُھوپ کنارا، شام ڈھلے
ملتے ہیں دونوں وقت جہاں
جو رات نہ دن، جو آج نہ کل
پل بھر کو امر، پل بھر میں دُھواں
اِس دُھوپ کنارے پل دو پل
ہونٹوں کی لپک
باہوں کی چھنک
یہ میل ہمارا جھوٹ نہ سچ
کیوں رار کرو، کیوں دوش دھرو
کس کارن جھوٹی بات کرو

جب تیری سمندر آنکھوں میں

اِس شام کا سورج ڈوبے گا

سُکھ سوئیں گے گھر دَر والے

اور راہی اپنی رہے گا۔

(لندن سے) ۱۹۹۳ء

رنگ ہے دل کا مرے

تم نہ آئے تھے تو ہر چیز وہی تھی کہ جو ہے :
آسماں حدِ نظر، راہگزر راہگزر، شیشۂ مے شیشۂ مے۔
اور اب شیشۂ مے، راہگزر، رنگِ فلک،
رنگ ہے دل کا مرے، "خونِ جگر ہونے تک"
چمپئی رنگ کبھی، راحتِ دیدار کا رنگ
سرمئی رنگ کہ ہے ساعتِ بیزار کا رنگ
زرد پتّوں کا خس و خار کا رنگ
سُرخ پھولوں کا دہکتے ہوئے گلزار کا رنگ
زہر کا رنگ، لہو رنگ، شبِ تار کا رنگ
آسماں، راہگزر، شیشۂ مے،

کوئی بھیگا ہوا دامن کوئی دُکھتی ہوئی رگ

کوئی ہر لحظہ بدلتا ہوا آئینہ ہے۔

اب جو آئے ہو تو ٹھہرو کہ کوئی رنگ کوئی رُت کوئی شے،

ایک جگہ پر ٹھہرے،

پھر سے اِک بار ہر اک چیز وہی ہو کہ جو ہے

آسماں حدِّ نظر، راہگزر راہگزر، شیشۂ مے شیشۂ مے۔

ماسکو، اگست ۱۹۶۳ء

پاس رہو

تم مرے پاس رہو

مرے قاتل، مرے دِلدار، مرے پاس رہو۔

جس گھڑی رات چلے،

آسمانوں کا لہو پی کے سیہ رات چلے

مرہمِ مُشک لیے، نشترِ الماس لیے

بَین کرتی ہوئی ہنستی ہوئی، گاتی نکلے

درد کے کاسنی پازیب بجاتی نکلے

جس گھڑی سینوں میں ڈوبے ہوئے دل

آستینوں میں نہاں ہاتھوں کی رہ تکنے لگیں

آس لیے،

اور بچّوں کے بلکنے کی طرح قُلقُلِ مے
بہرِ ناسودگی مچلے تو منائے نہ منے۔
جب کوئی بات بنائے نہ بنے
جب نہ کوئی بات چلے
جس گھڑی رات چلے
جس گھڑی ماتمی، سُنسان، سیہ رات چلے،
پاس رہو
مرے قاتل، مرے دلدار، مرے پاس رہو۔

ماسکو، ۱۹۶۳ء

منظر

رہگزر، سائے، شجر، منزل و در، حلقۂ بام
بام پر سینۂ مہتاب کھلا، آہستہ
جس طرح کھولے کوئی بندِ قبا، آہستہ
حلقۂ بام تلے، سایوں کا ٹھہرا ہوا نیل
نیل کی جھیل
جھیل میں چپکے سے تیرا کسی پتے کا حباب
ایک پل تیرا، چلا، پھوٹ گیا، آہستہ
بہت آہستہ، بہت ہلکا، خنک رنگِ شراب
میرے شیشے میں ڈھلا، آہستہ
شیشہ و جام، صراحی، ترے ہاتھوں کے گلاب
جس طرح دور کسی خواب کا نقش

آپ ہی آپ بنا اور مِٹا آہستہ

دِل سے نے دُہرایا کوئی حرفِ وفا آہستہ

تم نے کہا، "آہستہ"

چاند نے جُھک کے کہا

"اور ذرا آہستہ"

ماسکو ۱۹۶۴ء

لہُو کا سُراغ

کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہُو کا سُراغ
نہ دست و ناخنِ قاتل نہ آستیں پہ نشاں
نہ سُرخیٔ لبِ خنجر نہ رنگِ نوکِ سناں
نہ خاک پر کوئی دھبّا نہ بام پر کوئی داغ
کہیں نہیں ہے کہیں بھی نہیں لہُو کا سُراغ
نہ صرفِ خدمتِ شاہاں کہ خُوں بہا دیتے
نہ دیں کی نذر کہ بیعانۂ جزا دیتے

نہ رزم گاہ میں برسا کہ معتبر ہوتا
کسی علَم پہ رقم ہو کے مشتہر ہوتا

پکارتا رہا، بے آسرا، یتیم لہو
کسی کو بہرِ سماعت نہ وقت تھا نہ دماغ
نہ مدّعی، نہ شہادت، حساب پاک ہوا
یہ خونِ خاک نشیناں تھا، رزقِ خاک ہوا

یہاں سے شہر کو دیکھو

یہاں سے شہر کو دیکھو تو حلقہ در حلقہ
کھنچی ہے جیل کی صُورت ہر ایک سمت فصیل

ہر ایک راہ گزر گردشِ اسیراں ہے
نہ سنگِ میل، نہ منزل، نہ مخلصی کی سبیل

جو کوئی تیز چلے رہ تو پُوچھتا ہے خیال
کہ ٹوکنے کوئی للکار کیوں نہیں آئی

جو کوئی ہاتھ ہلائے تو وہم کو ہے سوال
کوئی چھنک، کوئی جھنکار کیوں نہیں آئی

یہاں سے شہر کو دیکھو تو ساری خلقت میں
نہ کوئی صاحبِ تمکیں، نہ کوئی والیِ ہوش

ہر ایک مردِ جواں مجرمِ رسن بہ گلو
ہر اِک حسینۂ رعنا، کنیزِ حلقہ بگوش
جو سائے دُور چراغوں کے گرد لرزاں ہیں
نہ جانے محفلِ غم ہے کہ بزمِ جام و سُبو
جو رنگ ہر در و دِیوار پر پریشاں ہیں
یہاں سے کچھ نہیں کُھلتا یہ پھُول ہیں کہ لہُو

غم نہ کر غم نہ کر

درد تھم جائے گا غم نہ کر غم نہ کر
یار لوٹ آئیں گے، دل ٹھہر جائے گا، غم نہ کر غم نہ کر
زخم بھر جائے گا
غم نہ کر، غم نہ کر
دن نکل آئے گا
غم نہ کر، غم نہ کر
ابر کھل جائے گا، رات ڈھل جائے گی
غم نہ کر، غم نہ کر
رُت بدل جائے گی
غم نہ کر، غم نہ کر

بلیک آؤٹ

جب سے بے نُور ہوئی ہیں شمعیں
خاک میں ڈھونڈتا پھرتا ہوں نہ جانے کس جا
کھو گئی ہیں میری دونوں آنکھیں
تم جو واقف ہو بتاؤ کوئی پہچان مری۔
اِس طرح ہے کہ ہر اِک رگ میں اُتر آیا ہے
مَوج در مَوج کسی زہر کا قاتل دریا
تیرا ارمان، تری یاد لیے جان مری
جانے کس مَوج میں غلطاں ہے کہاں دل میرا۔
ایک پل ٹھہرو کہ اُس پار کسی دُنیا سے
برق آئے مری جانب یدِ بیضا لے کر

اور مری آنکھوں کے گم گشتہ گُہر
جامِ ظلمت سے سیہ مست
نئی آنکھوں کے شب تاب گُہر
لَوٹا دے۔

ایک پل ٹھہرو کہ دریا کا کہیں پاٹ لگے
اور نیا دِل میرا
زہر میں ڈُھل کے، فنا ہو کے
کسی گھاٹ لگے

پھر پئے نذر نئے دیدہ و دِل لے کے چلوں
حُسن کی مدح کروں، شوق کا مضموں لکھوں

سپاہی کا مرثیہ

اُٹھو اب ماٹی سے اُٹھو!
جاگو میرے لال
اب جاگو میرے لال
تمہری سیج سجاون کارن
دیکھو آئی رین اندھیارن
نیلے شال دوشالے لے کر
جن میں اِن دُکھیَن اَکھیَن نے
ڈھیر کیے ہیں اتنے موتی
اتنے موتی جن کی جیوتی
دان سے تمہرا
جگ جگ لاگا

نام چمکنے۔

اُٹھو اب ماٹی سے اُٹھو!

جاگو میرے لال

اب جاگو میرے لال۔

گھر گھر بکھرا بھور کا کُندن

گھور اندھیرا اپنا آنگن۔

جانے کب سے راہ تکے ہیں

بالی دُلھنیا، بانکے ویرن

سُونا تمہرا راج پڑا ہے

دیکھو کتنا کاج پڑا ہے

بیری براجے راج سنگھاسن

تم ماٹی میں لال۔

اُٹھو اب ماٹی سے اُٹھو، جاگو میرے لال

ہٹ نہ کرو ماٹی سے اُٹھو، جاگو میرے لال

اب جاگو میرے لال!

ایک شہر آشوب کا آغاز

اب بزمِ سخن صحبتِ لب سوختگاں ہے
اب حلقۂ مے طائفۂ بے طلباں ہے

گھر رہیے تو ویرانیِ دل کھانے کو آوے
رہ چلیے تو ہر گام پہ غوغائے سگاں ہے

پیوندِ رہِ کوچۂ زر چشمِ غزالاں
پابوسِ ہوس افسرِ شمشاد قداں ہے

یاں اہلِ جنوں یک بہ دگر دست و گریباں
واں جیشِ ہوس تیغ بکف درپئے جاں ہے

اب صاحبِ انصاف ہے خود طالبِ انصاف
مُہر اس کی ہے میزان بہ دستِ دگراں ہے

ہم سہل طلب کون سے فرہاد تھے لیکن
اب شہر میں تیرے کوئی ہم سا بھی کہاں ہے

سوچنے دو

اِک ذرا سوچنے دو :

اِس خیاباں میں

جو اِس لحظہ بیاباں بھی نہیں

کون سی شاخ میں پھُول آئے تھے سب سے پہلے

کون بے رنگ ہُوئی رنج و تعَب سے پہلے۔

اور اب سے پہلے

کس گھڑی کون سے موسم میں یہاں

خوُن کا قحط پڑا

گُل کی شہ رگ پہ کڑا

وقت پڑا سوچنے دو

اک ذرا سوچنے دو:

یہ بھرا شہر جو اب وادیِ ویراں بھی نہیں
اس میں کس وقت کہاں
آگ لگی تھی پہلے
اس کے صف بستہ دریچوں میں سے کس میں اوّل
نہ ہوئی سُرخ شعاعوں کی کماں
کس جگہ جوت جگی تھی پہلے

سوچنے دو۔
ہم سے اُس دیس کا تُم نام ونشاں پُوچھتے ہو
جس کی تاریخ نہ جغرافیہ اب یاد آئے
اور یاد آئے تو محبوبِ گذشتہ کی طرح

رُوبرُو آنے سے جی گھبرائے۔
ہاں مگر جیسے کوئی
ایسے محبُوب یا محبُوبہ کا دل رکھنے کو
آنکلتا ہے کبھی رات بِتانے کے لیے
ہم اب اُس عمر کو آپہنچے ہیں جب ہم بھی یونہی
دِل سے مل آتے ہیں بس رسم نبھانے کے لیے
دِل کی کیا پُوچھتے ہو
سوچنے دو۔

سرِ وادیٔ سینا

عرب اسرائیل جنگ کے بعد

پھر برق فروزاں ہے سرِ وادیِ سینا
پھر رنگ پہ ہے شعلۂ رخسارِ حقیقت
پیغامِ اجل دعوتِ دیدارِ حقیقت

اے دیدۂ بینا!
اب وقت ہے دیدار کا دم ہے کہ نہیں ہے
اب قاتلِ جاں چارہ گرِ کلفتِ غم ہے
گلزارِ ارم پرتوِ صحرائے عدم ہے۔
پندارِ جنوں
حوصلۂ راہِ عدم ہے کہ نہیں ہے۔

پھر برق فروزاں ہے سرِ وادیٔ سینا، اے دیدۂ بینا!
پھر دِل کو مُصفّا کرو، اِس لوح پہ شاید
مابینِ من و تُو نیا پیماں کوئی اُترے۔
اب رسمِ ستم حکمتِ خاصانِ زمیں ہے
تائیدِ ستم مصلحتِ مُفتیٔ دیں ہے
اب صدیوں کے اقرارِ اطاعت کو بدلنے
لازم ہے کہ انکار کا فرماں کوئی اُترے۔

سُنو کہ شاید یہ نورِ صیقل
ہے اُس صحیفے کا حرفِ اوّل
جو ہر کس و ناکسِ زمیں پر
دلِ گدایانِ اجمعیں پر
اُتر رہا ہے فلک سے اب کے

سُنو کہ اِس حرفِ لم یزل کے
ہمیں تمہیں بندگانِ بے بس
علیم بھی ہیں خبیر بھی ہیں
سُنو کہ ہم بے زبان و بے کس
بشیر بھی ہیں نذیر بھی ہیں

ہر اک اولی الامر کو صدا دو
کہ اپنی فردِ عمل سنبھالے
اُٹھے گا جب جمِ سرفروشاں
پڑیں گے دار و رسن کے لالے کوئی نہ ہوگا کہ جو بچا لے
جزا سزا سب یہیں پہ ہوگی یہیں عذاب و ثواب ہوگا
یہیں سے اُٹھے گا شورِ محشر یہیں پہ روزِ حساب ہوگا

دُعا

آئیے ہاتھ اُٹھائیں ہم بھی
ہم جنہیں رسمِ دُعا یاد نہیں

ہم جنہیں سوزِ محبت کے سوا
کوئی بُت، کوئی خُدا یاد نہیں

آئیے عرض گزاریں کہ نگارِ ہستی
زہرِ امروز میں شیرینیِ فردا بھر دے

وہ جنہیں تابِ گراں باریِ ایام نہیں
اُن کی پلکوں پہ شب و روز کو ہلکا کر دے

جن کی آنکھوں کو رخِ صبح کا یارا بھی نہیں
اُن کی راتوں میں کوئی شمع منوّر کر دے

جن کے قدموں کو کسی رہ کا سہارا بھی نہیں
اُن کی نظروں پہ کوئی راہ اُجاگر کر دے

جن کا دیں پیرویِ کذب و ریا ہے اُن کو
ہمّتِ کفر ملے، جرأتِ تحقیق ملے

جن کے سر منتظرِ تیغِ جفا ہیں اُن کو
دستِ قاتل کو جھٹک دینے کی توفیق ملے

عشق کا سرِّ نہاں جانِ تپاں ہے جس سے
آج اقرار کریں اور تپش مٹ جائے

حرفِ حق دل میں کھٹکتا ہے جو کانٹے کی طرح
آج اظہار کریں اور خلش مٹ جائے

دِلدار دیکھنا

طوفاں بہ دِل ہے ہر کوئی دِلدار دیکھنا
گُل ہو نہ جائے مشعلِ رُخسار دیکھنا

آتش بہ جاں ہے ہر کوئی سرکار دیکھنا
لَو دے اُٹھے نہ طُرّۂ طرّار دیکھنا

جذبِ مُسافرانِ رہِ یار دیکھنا
سر دیکھنا، نہ سنگ نہ دیوار دیکھنا

کُوئے جفا میں قحطِ خریدار دیکھنا
ہم آ گئے تو گرمیٔ بازار دیکھنا

اُس دِل نوازِ شہر کے اطوار دیکھنا
بے اِلتفات بولنا، بیزار دیکھنا

خالی ہیں گرچہ مسند و منبر، نِگوں ہے خلق
رُعبِ قبا و ہیبتِ دستار دیکھنا

جب تک نصیب تھا ترا دیدار دیکھنا
جس سمت دیکھنا، گُل و گُلزار دیکھنا

پھر ہم تمیزِ روز و مہ و سال کر سکیں
اے یادِ یار پھر اِدھر اِک بار دیکھنا

ہارٹ اٹیک

درد اتنا تھا کہ اُس رات دلِ وحشی نے
ہر رگِ جاں سے اُلجھنا چاہا
ہر بُنِ مُو سے ٹپکنا چاہا
اور کہیں دُور ترے صحن میں گویا
پتّا پتّا مرے افسُردہ لہُو میں دُھل کر
حُسنِ مہتاب سے آزُردہ نظر آنے لگا۔
میرے ویرانۂ تن میں گویا
سارے دُکھتے ہوئے ریشوں کی طنابیں کُھل کر
سِلسلہ وار پتہ دینے لگیں

رُخصتِ قافلۂ شوق کی تیاری کا۔
اور جب یاد کی بُجھتی ہُوئی شمعوں میں نظر آیا کہیں
ایک پَل آخری لمحہ تری دلداری کا
درد اِتنا تھا کہ اِس سے بھی گزرنا چاہا
ہم نے چاہا بھی، مگر دل نہ ٹھہرنا چاہا۔

خورشیدِ محشر کی لَو

آج کے دن نہ پُوچھو مرے دوستو
دُور کتنے ہیں خوشیاں منانے کے دن
کھُل کے ہنسنے کے دن گیت گانے کے دن
پیار کرنے کے دن، دِل لگانے کے دن

آج کے دِن نہ پُوچھو مرے دوستو
زخم کتنے ابھی بختِ بسمل میں ہیں
دشت کتنے ابھی راہِ منزل میں ہیں
تیر کتنے ابھی دستِ قاتل میں ہیں

آج کا دن زبوں ہے مرے دوستو

آج کے دن تو یوں ہے مرے دوستو

جیسے درد و الم کے پرانے نشاں

سب چلے سوئے دل کارواں کارواں

ہاتھ سینے پہ رکھو تو ہر استخواں

سے اٹھے نالۂ الاماں ! الاماں!

آج کے دن نہ پوچھو مرے دوستو

کب تمہارے لہو کے دریدہ علَم

فرقِ خورشیدِ محشر پہ ہوں گے رقم

از کراں تا کراں کب تمہارے قدم

لے کے اٹھے گا وہ بحرِ خوں یم بہ یم

جس میں دھل جائے گا آج کے دن کا غم

سارے درد و الم سارے جَور و ستم
دُور کِتنی ہے خُورشیدِ محشر کی لَو
آج کے دِن نہ پُوچھو مرے دوستو

جرسِ گُل کی صدا

اِس ہوس میں کہ پکارے جرسِ گُل کی صدا
دشت و صحرا میں صبا پھرتی ہے یُوں آوارہ
جس طرح پھرتے ہیں ہم اہلِ جنُوں آوارہ

ہم پہ وارفتگیِ ہوش کی تُہمت نہ دھرو
ہم کہ رمّازِ رموزِ غمِ پنہانی ہیں
اپنی گردن پہ بھی ہے رشتہ فگن خاطرِ دوست
ہم بھی شوقِ رہِ دِلدار کے زِندانی ہیں

جب بھی ابرُوئے درِ یار نے ارشاد کیا
جس بیاباں میں بھی ہم ہوں گے چلے آئیں گے

درکھلا دیکھا تو شاید تمھیں پھر دیکھ سکیں،
بند ہوگا تو صدا دے کے چلے جائیں گے

فرشِ نومیدیِ دیدار

دیکھنے کی تو کسے تاب ہے لیکن اب تک
جب بھی اُس راہ سے گزرو تو کسی دُکھ کی کسک
ٹوکتی ہے کہ وہ دروازہ کھُلا ہے اب بھی
اور اُس صحن میں ہر سُو یُونہی پہلے کی طرح
فرشِ نومیدیِ دیدار بچھا ہے اب بھی

اور کہیں یاد کسی دِل زدہ بچّے کی طرح
ہاتھ پھیلائے ہُوئے بیٹھی ہے فریاد کُناں

دِل یہ کہتا ہے کہیں اور چلے جائیں جہاں
کوئی دروازہ عبث وا ہو، نہ بے کار کوئی
یادِ فریاد کا کشکول لیے بیٹھی ہو
محرمِ حسرتِ دیدار ہو دیوار کوئی
نہ کوئی سایۂ گُل، ہجرتِ گُل سے ویراں

یہ بھی کر دیکھا ہے سَو بار کہ جب راہوں میں
دیس پردیس کی بے مہر گزرگاہوں میں
قافلے قامت و رُخسار و لب و گیسُو کے
پردۂ چشم پہ یُوں اُترے ہیں بے صُورت و رنگ
جس طرح بند دریچوں پہ گرے بارشِ سنگ

اور دِل کہتا ہے ہر بار چلو لوٹ چلو
اِس سے پہلے کہ وہاں جائیں تو یہ دُکھ بھی نہ ہو

یہ نشانی کہ وہ دروازہ کھُلا ہے اب بھی
اور اُس صحن میں ہر سو یُونہی پہلے کی طرح
فرشِ نومیدیٔ دِیدار بچھا ہے اب بھی

ٹوٹی جہاں جہاں پہ کمند

رہا نہ کچھ بھی زمانے میں جب نظر کو پسند
تری نظر سے کیا رشتۂ نظر پیوند

ترے جمال سے ہر صبح پر وضو لازم
ہر ایک شب ترے در پر سجود کی پابند

نہیں رہا حرمِ دل میں اک صنم باطل
ترے خیال کے لات و منات کی سوگند

مثالِ زینۂ منزل بکارِ شوق آیا
ہر اک مقام کہ ٹوٹی جہاں جہاں پہ کمند

خزاں تمام ہوئی کس حساب میں لکھیے
بہارِ گل میں جو پہنچے ہیں شاخِ گل کو گزند

دریدہ دل ہے کوئی شہر میں ہماری طرح
کوئی دریدہ دہن شیخِ شہر کے مانند

شعار کی جو مداراتِ قامتِ جاناں
کیا ہے فیضِ دردِ دل، درِ فلک سے بلند

حذر کرو مرے تن سے

سجے تو کیسے سجے قتلِ عام کا میلا
کسے لبھائے گا میرے لہُو کا واویلا
مرے نزار بدن میں لہُو ہی کتنا ہے
چراغ ہو کوئی روشن نہ کوئی جام بھرے
نہ اس سے آگ ہی بھڑکے نہ اس سے پیاس بجھے
مرے فگار بدن میں لہُو ہی کتنا ہے
مگر وہ زہرِ ہلاہل بھرا ہے نس نس میں
جسے بھی چھیدو ہر اک بُوند زہرِ افعی ہے
ہر اِک کشید ہے صدیوں کے درد و حسرت کی
ہر اک میں مُہر بلب غیظ و غم کی گرمی ہے

حذر کرو مرے تن سے یہ سم کا دریا ہے

حذر کرو کہ مرا تن وہ چوبِ صحرا ہے

جسے جلاؤ تو صحنِ چمن میں دہکیں گے

بجائے سرو سمن میری ہڈیوں کے ببول

اسے بکھیرا تو دشت و دمن میں بکھرے گی

بجائے مشکِ صبا، میری جانِ زار کی دھول

حذر کرو کہ مرا دِل لہو کا پیاسا ہے!

تہ بہ تہ دِل کی کدُورت
میری آنکھوں میں اُمنڈ آئی تو کچُھ چارہ نہ تھا۔
چارہ گر کی مان لی
اور مَیں نے گرد آلُود آنکھوں کو لہُو سے دھولیا
اور اب ہر شکل و صُورت
عالمِ موجُود کی ہر ایک شَے
میری آنکھوں کے لہُو سے اس طرح ہم رنگ ہے:
خورشید کا کُندن لہُو
مہتاب کی چاندی لہُو
صُبحوں کا ہنسنا بھی لہُو
راتوں کا رونا بھی لہُو

ہر شجر مینارِ خوں، ہر پھول خونیں دیدہ ہے،
ہر نظر اِک تارِ خوں، ہر عکس خوں مالیدہ ہے۔
موجِ خوں جب تک رواں رہتی ہے اس کا سُرخ رنگ
جذبۂ شوقِ شہادت، درد، غیظ و غم کا رنگ۔
اور تھم جائے تو کجلا کر
فقط نفرت کا، شب کا، موت کا
ہر رنگ کے ماتم کا رنگ۔

چارہ گر ایسا نہ ہونے دے
کہیں سے لا کوئی سیلابِ اشک
آبِ وضو
جس میں دُھل جائیں تو شاید دُھل سکے
میری آنکھوں، میری گرد آلود آنکھوں کا لہو۔

غبارِ خاطرِ محفل ٹھہر جائے

کہیں تو کاروانِ درد کی منزل ٹھہر جائے
کنارے آلگے عمرِ رواں یا دِل ٹھہر جائے

اماں کیسی کہ موجِ خوں ابھی سر سے نہیں گزری
گزر جائے تو شاید بازوئے قاتل ٹھہر جائے

کوئی دم بادبانِ کشتیِ صہبا کو تہ رکھو
ذرا ٹھہرو غبارِ خاطرِ محفل ٹھہر جائے

خُمِ ساقی میں جُز زہرِ ہلاہل کچھ نہیں باقی
جو ہو محفل میں اس اکرام کے قابل ٹھہر جائے

ہماری خامشی بس دل سے لب تک ایک وقفہ ہے
یہ طوفاں ہے جو پل بھر بر لبِ ساحل ٹھہر جائے

نگاہِ منتظر کب تک کرے گی آئینہ بندی
کہیں تو دشتِ غم میں یار کا محمل ٹھہر جائے

جس روز قضا آئے گی

کِس طرح آئے گی جِس روز قضا آئے گی
شاید اِس طرح کہ جِس طور کبھی اوّلِ شب
بے طلب پہلے پہل مرحمتِ بوسۂ لب
جِس سے کُھلنے لگیں ہر سمت طلسمات کے در
اور کہیں دُور سے انجان گلابوں کی بہار
یک بیک سینۂ مہتاب کو تڑپانے لگے

شاید اِس طرح کہ جِس طور کبھی آخرِ شب
نیم وا کلیوں سے سرسبز سحر
یک بیک حُجرۂ محبُوب میں لہرانے لگے

اور خاموش دریچوں سے بہ ہنگامِ رحیل
جھنجھناتے ہُوئے تاروں کی صدا آنے لگے

کِس طرح آئے گی جس روز قضا آئے گی
شاید اِس طرح کہ جِس طور تہِ نوکِ سِناں
کوئی رگ واہمۂ درد سے چِلّانے لگے
اور قزاقِ سِناں دست کا دُھندلا سایہ
از کراں تابہ کراں دہر پہ منڈلانے لگے

جس طرح آئے گی جِس روز قضا آئے
خواہ قاتل کی طرح آئے کہ محبُوب صفت
دِل سے بس ہو گی یہی حرفِ وِداع کی صورت
لِلّٰہِ الحمد بانجامِ دِلِ دِل زدگاں
کلمۂ شُکر بنامِ لبِ شیریں دہناں

اشک آباد کی شام

جب سُورج نے جاتے جاتے
اشک آباد کے نیلے اُفق سے

اپنے سنہری جام

میں ڈھالی

سُرخیِ اوّلِ شام۔

اور یہ جام
تمھارے سامنے رکھ کر

تُم سے کیا کلام

کہا: پرنام!
اُٹھو

اور اپنے تن کی سیج سے اُٹھ کر

اِک شیریں پیغام

ثبت کرو اِس شام

کسی کے نام

کنارِ جام۔

شاید تم یہ مان گئیں اور تُم نے

اپنے لبِ گُلفام

کئے انعام

کسی کے نام

کنارِ جام۔

یا شاید

تم اپنے تن کی سیج پہ سج کر

تھیں یوں محوِ آرام
کہ رستہ تکتے تکتے
بجھ گئی شمعِ جام؛
اشک آباد کے نیلے اُفق پر
غارت ہو گئی شام۔

مرے درد کو

مرا درد نغمۂ بے صدا
مری ذات ذرّۂ بے نشاں
مرے درد کو جو زباں ملے
مجھے اپنا نام و نشاں ملے

مری ذات کا جو نشاں ملے
مجھے رازِ نظمِ جہاں ملے
جو مجھے یہ رازِ نہاں ملے
مری خامشی کو بیاں ملے
مجھے کائنات کی سروری
مجھے دولتِ دو جہاں ملے

پاؤں سے لہو کو دھو ڈالو

ہم کیا کرتے کِس رہ چلتے
ہر راہ میں کانٹے بکھرے تھے
اُن رِشتوں کے جو چھُوٹ گئے
اُن صدیوں کے یارانوں کے
جو اِک اِک کر کے ٹُوٹ گئے
جس راہ چلے جس سمت گئے
یُوں پاؤں لہُو لہان ہُوئے
سب دیکھنے والے کہتے تھے
یہ کیسی رِیت رچائی ہے
یہ مہندی کیوں لگائی ہے

وہ کہتے تھے، کیوں قحطِ وفا
کا ناحق چرچا کرتے ہو
پاؤں سے لہُو کو دھو ڈالو
یہ راہیں جب اَٹ جائیں گی
سو رستے اِن سے پُھوٹیں گے
تم دِل کو سنبھالو جس میں ابھی
سو طرح کے نشتر ٹوٹیں گے

سجّاد ظہیر کے نام

نہ اب ہم ساتھ سیرِ گُل کریں گے
نہ اب مِل کر سرِ مقتل چلیں گے
حدیثِ دلبراں باہم کریں گے
نہ خُونِ دِل سے شرحِ غم کریں گے
نہ لیلائے سخن کی دوست داری
نہ غمہائے وطن پر اشکباری
سُنیں گے نغمۂ زنجیر مِل کر
نہ شب بھر مِل کے چھلکائیں گے ساغر

بنامِ شاہدِ نازک خیالاں
بیادِ مستیٔ چشمِ غزالاں
بنامِ انبساطِ بزمِ رنداں
بیادِ کلفتِ ایّامِ زنداں

صبا اور اس کا اندازِ تکلم
سحر اور اس کا اندازِ تبسم
فضا میں ایک ہالہ سا جہاں ہے
یہی تو مسندِ پیرِ مغاں ہے

سحر گہ اب اُسی کے نام ساقی
کریں اِتمامِ دورِ جام ساقی

بساطِ بادہ و مینا اٹھا لو
بڑھا دو شمعِ محفل بزم والو
پیو اب ایک جامِ الوداعی
پیو اور پی کے ساغر توڑ ڈالو!

(دہلی ستمبر ۱۹۷۳ء)

اے شام مہرباں ہو!

اے شام مہرباں ہو
اے شامِ شہرِ یاراں
ہم پہ مہرباں ہو
دوزخی دوپہر ستم کی
بے سبب ستم کی
دوپہر درد و غیظ و غم کی
بے زباں درد و غیظ و غم کی
اِس دوزخی دوپہر کے تازیانے
آج تن پر دھنک کی صورت
قوس در قوس بٹ گئے ہیں

زخم سب کھل گئے ہیں جن کے
داغ جانا تھا چھٹ گئے ہیں۔
تیرے توشے میں کچھ تو ہو گا
مرہم درد کا دوشالہ
تن کے اس انگ پر اُڑھا دے
درد سب سے سوا جہاں ہو۔
اے شام مہرباں ہو
اے شام شہریاراں
ہم پہ مہرباں ہو
دوزخی دشت نفرتوں کے
بے درد نفرتوں کے
کرچیاں دیدۂ حسد کی

خس و خاشاک رنجشوں کے
اتنی سنسان شاہراہیں
اتنی گنجان قتل گاہیں
جن سے آئے ہیں ہم گزر کر
آبلہ بن کے ہر قدم پر
یوں پاؤں کٹ گئے ہیں
رستے سمٹ گئے ہیں
مخملیں اپنے بادلوں کی
آج پاؤں تلے بچھا دے
شافیِ کربِ رہرواں ہو
اے شام مہرباں ہو۔
اے مہِ شبِ نگاراں

اے رفیقِ دلفگاراں

اس شام ہمزباں ہو

اے شام مہرباں ہو

اے شام مہرباں ہو

اے شامِ شہریاراں

ہم پہ مہرباں ہو۔

گیت

چلو پھر سے مُسکرائیں
چلو پھر سے دِل جلائیں

جو گُزر گئی ہیں راتیں
انہیں پھر جگا کے لائیں
جو بسر گئی ہیں باتیں
اُنھیں یاد میں بُلائیں
چلو پھر سے دِل لگائیں
چلو پھر سے مُسکرائیں۔

کسی شہ نشیں پہ جھلکی
وہ دھنک کسی قبا کی
کسی رگ میں کسمسائی
وہ کسک کسی ادا کی

کوئی حرفِ بے مروّت
کسی کُنجِ لب سے پھُوٹا
وہ چھنک کے شیشۂ دل
تہِ بام پھر سے ٹُوٹا۔

یہ مِلن کی، نامِلن کی
یہ لگن کی اور جلن کی

جو سہی ہیں وارداتیں
جو گزر گئی ہیں راتیں

جو بسر گئی ہیں باتیں
کوئی ان کی دُھن بنائیں
کوئی ان کا گیت گائیں۔

چلو پھر سے مُسکرائیں
چلو پھر سے دل جلائیں

ہم تو مجبور تھے اِس دِل سے

ہم تو مجبور تھے اِس دِل سے کہ جس میں ہر دم
گردشِ خُوں سے وہ کُہرام بپا رہتا ہے
جیسے رِندانِ بلانوش جو مِل بیٹھیں بہم
میکدے میں سفرِ جام بپا رہتا ہے
سوزِ خاطر کو مِلا جب بھی سہارا کوئی
داغِ حرمان کوئی، دردِ تمنّا کوئی
مرہمِ یاس سے مائل بہ شفا ہونے لگا
زخمِ امّید کوئی پھر سے ہرا ہونے لگا

ہم تو مجبور تھے اِس دِل سے کہ جس کی ضِد پر
ہم نے اُس رات کے ماتھے پہ سحر کی تحریر

جس کے دامن میں اندھیرے کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔
ہم نے اس دشت کو ٹھہرا لیا فردوس نظیر
جس میں جز صنعتِ خونِ سرِ پا کچھ بھی نہ تھا
دِل کو تعبیر کوئی اور گوارا ہی نہ تھی
کُلفتِ زیست تو منظور تھی ہر طور مگر
راحتِ مرگ کسی طور گوارا ہی نہ تھی

ڈھاکہ سے واپسی پر

ہم کہ ٹھہرے اجنبی اِتنی مداراتوں کے بعد
پھر بنیں گے آشنا کِتنی مُلاقاتوں کے بعد

کب نظر میں آئے گی بے داغ سبزے کی بہار
خُون کے دھبّے دُھلیں گے کِتنی برساتوں کے بعد

تھے بہت بے درد لمحے ختمِ دردِ عشق کے
تھیں بہت بے مہر صُبحیں مہرباں راتوں کے بعد

دِل تو چاہا پر شکستِ دِل نے مُہلت ہی نہ دی
کچھ گلے شِکوے بھی کر لیتے مُناجاتوں کے بعد

اُن سے جو کہنے گئے تھے فیضؔ جاں صدقہ کیے

اَن کہی ہی رہ گئی وہ بات سب باتوں کے بعد

بہار آئی

بہار آئی تو جیسے یکبار
لوٹ آئے ہیں پھر عدم سے
وہ خواب سارے، شباب سارے
جو تیرے ہونٹوں پہ مر مٹے تھے
جو مٹ کے ہر بار پھر جئے تھے۔
نکھر گئے ہیں گلاب سارے
جو تیری یادوں سے مشکبو ہیں
جو تیرے عشّاق کا لہو ہیں۔
اُبل پڑے ہیں عذاب سارے
ملالِ احوالِ دوستاں بھی

خمارِ آغوشِ مہ وشاں بھی
غبارِ خاطر کے باب سارے
ترے ہمارے
سوال سارے، جواب سارے۔
بہار آئی تو کُھل گئے ہیں
نئے سرے سے حساب سارے۔

تُم اپنی کرنی کر گُزرو

اب کیوں اُس دِن کا ذِکر کرو
جب دِل ٹُکڑے ہو جائے گا
اور سارے غم مِٹ جائیں گے
جو کُچھ پایا کھو جائے گا
جو مِل نہ سکا وہ پائیں گے
یہ دِن تو وہی پہلا دِن ہے
جو پہلا دِن تھا چاہت کا
ہم جِس کی تمنّا کرتے رہے
اور جِس سے ہر دم ڈرتے رہے
یہ دِن تو کِتنی بار آیا

سو بار بسے اور اُجڑ گئے

سو بار لُٹے اور بھر پایا
اب کیوں اُس دِن کی فِکر کرو
جب دِل ٹُکڑے ہو جائے گا
اور سارے غم مِٹ جائیں گے
تُم خوف و خطر سے در گُزرو
جو ہونا ہے سو ہونا ہے
گر ہنسنا ہے تو ہنسنا ہے
گر رونا ہے تو رونا ہے
تُم اپنی کرنی کر گُزرو
جو ہو گا دیکھا جائے گا!

موری ارج سُنو

(نذرِ خُسرو)

"موری ارج سُنو دست گیر پیر"

"مائی ری، کہوں کا سے مَیں

اپنے جیا کی پیڑ"

"نیّا باندھو رے

باندھو رے کنارِ دریا"

"مورے مندر اب کیوں نہیں آئے"

اِس صُورت سے

عرض سناتے

درد بتاتے

نیّا کھیتے

منّت کرتے

رستہ تکتے

کتنی صدیاں بیت گئی ہیں۔

اب جا کر یہ بھید کھُلا ہے

جس کو تُم نے عرض گزاری

جو تھا ہاتھ پکڑنے والا

جس جا لاگی ناؤ تُمھاری

جس سے دُکھ کا دارُو مانگا

تورے مندر میں جو نہیں آیا

وہ تو تمھیں تھے!

وہ تو تمھیں تھے!

لینن گراڈ کا قبرستان

سرد سِلوں پر

زرد سِلوں پر

تازہ گرم لہو کی صورت

گُلدستوں کے چھینٹے ہیں

کتبے سب بے نام ہیں لیکن

ہر اک پھول پہ نام لکھا ہے

غافل سونے والے کا

یاد میں رونے والے کا

اپنے فرض سے فارغ ہو کر

اپنے لہو کی تان کے چادر

سارے بیٹے خواب میں ہیں

اپنے غموں کا ہار پرو کر

امّاں اکیلی جاگ رہی ہے

کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا

وہ لوگ بہت خوش قسمت تھے
جو عشق کو کام سمجھتے تھے
یا کام سے عاشقی کرتے تھے۔
ہم جیتے جی مصروف رہے
کچھ عشق کیا، کچھ کام کیا
کام عشق کے آڑے آتا رہا
اور عشق سے کام اُلجھتا رہا
پھر آخر تنگ آکر ہم نے
دونوں کو اُدھورا چھوڑ دیا۔

درِ اُمّید کے دریُوزہ گر

پھر پھریرے بن کے میرے تن بدن کی دھجّیاں
شہر کے دیوار و در کو رنگ پہنانے لگیں

پھر کف آلودہ زبانیں مدح و ذم کی قمچیاں
میرے ذہن و گوش کے زخموں پہ برسانے لگیں

پھر نکل آئے ہوسناکوں کے رقصاں طائفے
دردمندِ عشق پر ٹھٹھے لگانے کے لیے

پھر دُہل کرنے لگے تشہیرِ اخلاص و وفا
کُشتۂ صدق و صفا کا دِل جلانے کے لیے

ہم کہ ہیں کب سے درِ اُمید کے دریوزہ گر
یہ گھڑی گزری تو پھر دستِ طلب پھیلائیں گے

کُوچہ و بازار سے پھر چُن کے ریزہ ریزہ خواب
ہم یونہی پہلے کی صُورت جوڑنے لگ جائیں گے

آج اِک حرف کو پھر

آج اِک حرف کو پھر ڈھونڈتا پھرتا ہے خیال

مدھ بھرا حرف کوئی، زہر بھرا حرف کوئی

دِل نشیں حرف کوئی، قہر بھرا حرف کوئی

حرفِ اُلفت کوئی دِلدارِ نظر ہو جیسے

جس سے مِلتی ہے نظر بوسۂ لب کی صُورت

اِتنا روشن کہ سرِ موجۂ زر ہو جیسے

صحبتِ یار میں آغازِ طرب کی صُورت

حرفِ نفرت کوئی شمشیرِ غضب ہو جیسے

تا ابد شہرِ ستم جس سے تبہ ہو جائیں

اِتنا تاریک کہ شمشان کی شب ہو جیسے

لب پہ لاؤں تو مرے ہونٹ سیہ ہو جائیں

(۲)

آج ہر سُر سے ہر اِک راگ کا ناتا ٹوٹا
ڈھونڈتی پھرتی ہے مُطرب کو پھر اُس کی آواز
جوششِ درد سے مجنُوں کے گریباں کی طرح
آج ہر موج ہوا سے ہے سوالی خلقت
لا کوئی نغمہ، کوئی صَوت، تری عمر دراز
نوحۂ غم ہی سہی، شورِ شہادت ہی سہی
صُورِ محشر ہی سہی، بانگِ قیامت ہی سہی

مرثیۂ امامؑ

رات آئی ہے شبیرؑ پہ یلغارِ بلا ہے
ساتھی نہ کوئی یار نہ غمخوار رہا ہے
مونس ہے تو اک درد کی گھنگھور گھٹا ہے
مشفق ہے تو اک دِل کے دھڑکنے کی صدا ہے
تنہائی کی، غربت کی، پریشانی کی شب ہے
یہ خانۂ شبیرؑ کی ویرانی کی شب ہے

دشمن کی سپہ خواب میں مدہوش پڑی تھی
پل بھر کو کسی کی نہ اِدھر آنکھ لگی تھی
ہر ایک گھڑی آج قیامت کی گھڑی تھی
یہ رات بہت آلِ محمدؐ پہ کڑی تھی

رہ رہ کے بُکا اہلِ حرم کرتے تھے ایسے
تھم تھم کے دیا آخرِ شب جلتا ہے جیسے

اِک گوشے میں ان سوختہ سامانوں کے سالار
اِن خاک بسر خانماں ویرانوں کے سردار
تشنہ لب و درماندہ و مجبور و دل افگار
اِس شان سے بیٹھے تھے شہِ لشکرِ احرار

مسند تھی، نہ خلعت تھی، نہ خدّام کھڑے تھے
ہاں تن پہ جدھر دیکھیے سو زخم سجے تھے

کچھ خوف تھا چہرے پہ نہ تشویش ذرا تھی
ہر ایک ادا مظہرِ تسلیم و رضا تھی

ہر ایک نگہ شاہدِ اقرارِ وفا تھی
ہر جُنبشِ لب مُنکرِ دستورِ جفا تھی

پہلے تو بہت پیار سے ہر فرد کو دیکھا
پھر نام خُدا کا لیا اور یُوں ہُوئے گویا

الحمد قریب آیا غمِ عشق کا ساحل
الحمد کہ اب صبحِ شہادت ہُوئی نازل

بازی ہے بہت سخت میانِ حق و باطل
وہ ظلم میں کامل ہیں تو ہم صبر میں کامل

بازی ہُوئی انجام، مُبارک ہو عزیزو
باطل ہوا ناکام، مُبارک ہو عزیزو

پھر صُبح کی لَو آئی رُخِ پاک پہ چمکی
اور ایک کرن مقتلِ خُوںناک پہ چمکی
نیزے کی انی تھی خس و خاشاک پہ چمکی
شمشیر برہنہ تھی کہ افلاک پہ چمکی

دم بھر کے لیے آئینہ رُو ہو گیا صحرا
خُورشید جو اُبھرا تو لہُو ہو گیا صحرا

پَر باندھے ہُوئے حملے کو آئی صفِ اعدا
تھا سامنے اِک بندۂ حق یکّہ و تنہا
ہر چند کہ ہر اِک تھا اُدھر خُون کا پیاسا
یہ رُعب کا عالم کہ کوئی پہل نہ کرتا

کی آنے میں تاخیر جو لیلائے قضا نے
خُطبہ کیا اِرشاد امامِ شُہدا نے

فرمایا کہ کیوں درپئے آزار ہو لوگو
حق والوں سے کیوں برسرِ پیکار ہو لوگو
واللہ کہ مجرم ہو، گنہگار ہو لوگو
معلوم ہے کچھ کس کے طرفدار ہو لوگو

کیوں آپ کے آقاؤں میں اور ہم میں ٹھنی ہے
معلوم ہے کس واسطے اس جاں پہ بنی ہے

سطوت نہ حکومت نہ حشم چاہیئے ہم کو
اورنگ نہ افسر، نہ علم چاہیئے ہم کو
زر چاہیئے، نے مال و درم چاہیئے ہم کو
جو چیز بھی فانی ہے وہ کم چاہیئے ہم کو

سرداری کی خواہش ہے نہ شاہی کی ہوس ہے
اِک حرفِ یقیں، دولتِ ایماں ہمیں بس ہے

طالب ہیں اگر ہم تو فقط حق کے طلب گار
باطل کے مقابل ہیں صداقت کے طلب گار

انصاف کے، نیکی کے، مروّت کے طرف دار
ظالم کے مخالف ہیں تو بیکس کے مددگار

جو ظلم پہ لعنت نہ کرے، آپ لعیں ہے
جو جبر کا منکر نہیں وہ منکرِ دیں ہے

تا حشر زمانہ تمھیں مکّار کہے گا
تم عہد شکن ہو، تمھیں غدّار کہے گا

جو صاحبِ دل ہے، ہمیں ابرار کہے گا
جو بندۂ حُر ہے، ہمیں احرار کہے گا

نام اُونچا زمانے میں ہر انداز رہے گا
نیزے پہ بھی سر اپنا سرافراز رہے گا

کر ختم سخن محوِ دعا ہو گئے شبیرؓ

پھر نعرہ زناں محوِ وغا ہو گئے شبیرؓ

قربانِ رہِ صدق و صفا ہو گئے شبیرؓ

خیموں میں بپا کہرام جدا ہو گئے شبیرؓ

مرکب پہ تنِ پاک تھا اور خاک پہ سر تھا

اس خاک تلے جنّتِ فردوس کا در تھا

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

مدح

حسین شہید سہروردی مرحوم نے راولپنڈی
سازش کیس میں ملزموں کی جانب سے وکالت کی تھی
مقدمے کے خاتمے پر انھیں یہ سپاسنامہ پیش کیا گیا۔

کس طرح بیاں ہو ترا پیرایۂ تقریر
گویا سرِ باطل پہ چمکنے لگی شمشیر
وہ زور ہے اِک لفظ اِدھر نُطق سے نکلا
واں سینۂ اغیار میں پیوست ہُوئے تیر
گرمی بھی ہے ٹھنڈک بھی، روانی بھی سکوں بھی
تاثیر کا کیا کہیے، ہے تاثیر سی تاثیر

اعجاز اسی کا ہے کہ اربابِ ستم کی
اب تک کوئی انجام کو پہنچی نہیں تدبیر
اطرافِ وطن میں ہوا حق بات کا شُہرہ
ہر ایک جگہ مکر و ریا کی ہُوئی تشہیر
روشن ہُوئے اُمّید سے رُخ اہلِ وفا کے
پیشانیٔ اعدا پہ سیاہی ہُوئی تحریر

۲
حُرّیتِ آدم کی رہِ سخت کے رہگیر
خاطر میں نہیں لاتے خیالِ دمِ تعزیر
کچھ ننگ نہیں رنجِ اسیری کہ پُرانا
مردانِ صفاکیش سے ہے رشتۂ زنجیر
کب دبدبۂ جبر سے ڈرتے ہیں کہ جن کے
ایمان و یقیں دل میں کیے رہتے ہیں تنویر

معلوم ہے اِن کو کہ رِہا ہو گی کِسی دِن
ظالم کے گراں ہاتھ سے مظلوم کی تقدیر

آخر کو سرافراز ہوا کرتے ہیں احرار
آخر کو گرا کرتی ہے ہر جَور کی تعمیر

ہر دَور میں سر ہوتے ہیں قصرِ جم و دارا
ہر عہد میں دیوارِ ستم ہوتی ہے تسخیر

ہر دَور میں ملعون شقاوت ہے شِمر کی
ہر عہد میں مسعود ہے قربانیِ شبیرؓ

کرتا ہے قلم اپنے لبِ نُطق کی تطہیر
پہنچی ہے سرِ حرفِ دُعا اب مری تحریر

ہر کام میں برکت ہو ہر اِک قول میں قُوّت
ہر گام پہ ہو منزلِ مقصود قدم گیر

ہر لحظہ ترا طالعِ اقبال سوا ہو
ہر لحظہ مددگار ہو تدبیر کی تقدیر
ہر بات ہو مقبول، ہر اِک بول ہو بالا
کچھ اور بھی رونق میں بڑھے شعلۂ تقریر
ہر دِن ہو ترا لُطفِ زباں اَور زیادہ
اللہ کرے زورِ بیاں اَور زیادہ

گیت

منزلیں، منزلیں
شوقِ دیدار کی منزلیں
حُسنِ دِلدار کی منزلیں، پیار کی منزلیں
پیار کی بے پنہ رات کی منزلیں
کہکشاؤں کی بارات کی منزلیں
بلندی کی، ہمّت کی، پرواز کی
جوشِ پرواز کی منزلیں
راز کی منزلیں
زِندگی کی کٹھن راہ کی منزلیں

بلندی کی، ہمّت کی، پرواز کی منزلیں
جوشِ پرواز کی منزلیں
راز کی منزلیں—
آن سے ملنے کے دِن
پھُول کِھلنے کے دِن
وقت کے گھور ساگر میں صبح کی
شام کی منزلیں
چاہ کی منزلیں
آس کی، پیاس کی
حسرتِ یار کی
پیار کی منزلیں
منزلیں حُسنِ عالم کے گلزار کی

منزلیں، منزلیں

موج در موج ڈھلتی ہُوئی رات کے درد کی منزلیں

چاندتاروں کے وِیران سنسار کی منزلیں،

اپنی دھرتی کے آباد بازار کی منزلیں،

حق کے عرفان کی

نُورِ انوار کی منزلیں

وصلِ دِلدار کی منزلیں

قول و اقرار کی منزلیں

منزلیں، منزلیں!

گیت

اب کیا دیکھیں راہ تمھاری

بیت چلی ہے رات۔

چھوڑو،

چھوڑو غم کی بات۔

تھم گئے آنسو

تھک گئیں اَکھیاں

گزر گئی برسات،

بیت چلی ہے رات

چھوڑو،

چھوڑو غم کی بات۔
کب سے آس لگی درشن کی
کوئی نہ جانے بات
کوئی نہ جانے بات
بیت چلی ہے رات
چھوڑو غم کی بات۔
تم آؤ تو من میں اُترے
پھولوں کی بارات
بیت چلی ہے رات۔
اب کیا دیکھیں راہ تمھاری
بیت چلی ہے رات۔

گیت

ہم تیرے پاس آئے
سارے بھرم مٹا کر
سب چاہتیں بُھلا کر
کتنے اُداس آئے
ہم تیرے پاس جا کر
کیا کیا نہ دِل دُکھا ہے
کیا کیا بہی ہیں اکھیاں
کیا کیا نہ ہم پہ بیتی
کیا کیا ہُوئے پریشاں

ہم تُجھ سے دل لگا کر
تُجھ سے نظر ملا کر
کِتنے فریب کھائے
اپنا تُجھے بنا کر
ہم تیرے پاس آئے
سارے بھرم مٹا کر
تھی آس آج ہم پر کچھ ہو گی مہربانی
ہلکا کریں گے جی کو سب حالِ دل زبانی
تُجھ کو سُنا سُنا کر
آنسو بہا بہا کر
کِتنے اُداس آئے
ہم تیرے پاس جا کر

ہم تیرے پاس آئے
سارے بھرم مٹا کر

اُمیدِ سحر کی بات سُنو

جگر دریدہ ہوں، چاکِ جگر کی بات سُنو
اَلم رسیدہ ہوں، دامانِ تر کی بات سُنو
زباں بُریدہ ہوں زخمِ گلو سے حرف کرو
شکستہ پا ہوں ملالِ سفر کی بات سُنو
مُسافرِ رہِ صحرائے ظلمتِ شب سے
اب التفاتِ نگارِ سحر کی بات سُنو
سحر کی بات اُمیدِ سحر کی بات سُنو

دلِ من

مرے دل، مرے مُسافر
ہوا پھر سے حُکم صادر
کہ وطن بدر ہوں ہم تُم
دیں گلی گلی صدائیں!
کریں رُخ نگر نگر کا
کہ سُراغ کوئی پائیں
کسی یارِ نامہ بر کا
ہر اِک اجنبی سے پُوچھیں
جو پتہ تھا اپنے گھر کا

سرِ کوئے ناشنایاں
ہمیں دِن سے رات کرنا
کبھی اِس سے بات کرنا
کبھی اُس سے بات کرنا
تُمھیں کیا کہوں کہ کیا ہے
شبِ غم بُری بلا ہے
ہمیں یہ بھی تھا غنیمت
جو کوئی شمار ہوتا
ہمیں کیا بُرا تھا مرنا
اگر ایک بار ہوتا

لندن ۱۹۷۸ء

پھُول مُرجھا گئے

پھُول مُرجھا گئے ہیں سارے
تھمتے نہیں آسماں کے آنسو
شمعیں بے نُور ہو گئی ہیں
آئینے چُور ہو گئے ہیں
ساز سب بج کے کھو گئے ہیں
پائلیں بُجھ کے سو گئی ہیں

اور ان بادلوں کے پیچھے
دُور اِس رات کا دُلارا

درد کا ستارہ

ٹمٹما رہا ہے

جھنجھنا رہا ہے

مسکرا رہا ہے

لندن ۱۹۷۸ء

کوئی عاشق کسی محبوبہ سے

گلشنِ یاد میں گر آج دمِ بادِ صبا
پھر سے چاہے کہ گُل افشاں ہو تو ہو جانے دو
عُمرِ رفتہ کے کسی طاق پہ بِسرا ہوا درد
پھر سے چاہے کہ فروزاں ہو تو ہو جانے دو

جیسے بیگانے سے اب ملتے ہو ویسے ہی سہی
آؤ دو چار گھڑی میرے مقابل بیٹھو

گرچہ مل بیٹھیں گے ہم تم تو مُلاقات کے بعد
اپنا احساسِ زیاں اور زیادہ ہو گا۔

ہم سخن ہوں گے جو ہم دونوں تو ہر بات کے بیچ
اَن کہی بات کا موہوم سا پردہ ہو گا

کوئی اقرار نہ مَیں یاد دِلاؤں گا نہ تُم
کوئی مضموں نہ وفا کا نہ جفا کا ہو گا

گردِ ایّام کی تحریر کو دھونے کے لیے
تُم سے گویا ہوں دمِ دید جو میری پلکیں

تُم جو چاہو تو سُنو
اور جو نہ چاہو نہ سُنو

اور جو حرف کریں مجھ سے گریزاں آنکھیں
تُم جو چاہو تو کہو
اور جو نہ چاہو نہ کہو

لندن، ۱۹۷۰ء

وَيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ

ہم دیکھیں گے
لازم ہے کہ ہم بھی دیکھیں گے
وہ دِن کہ جِس کا وعدہ ہے
جو لوحِ ازل میں لکھّا ہے
جب ظلم و سِتم کے کوہِ گراں
رُوئی کی طرح اُڑ جائیں گے
ہم محکوموں کے پاؤں تلے
جب دھرتی دھڑ دھڑ دھڑکے گی
اور اہلِ حکَم کے سر اُوپر

جب بجلی کڑکڑ کڑکے گی
جب ارضِ خدا کے کعبے سے
سب بُت اُٹھوائے جائیں گے
ہم اہلِ صفا، مردُودِ حرم
مسند پہ بٹھائے جائیں گے
سب تاج اُچھالے جائیں گے
سب تخت گرائے جائیں گے
بس نام رہے گا اللہ کا
جو غائب بھی ہے حاضر بھی
جو منظر بھی ہے ناظر بھی
اُٹّھے گا انا الحق کا نعرہ
جو مَیں بھی ہوں اور تم بھی ہو

اور راج کرے گی خلقِ خُدا
جو میں بھی ہوں اور تُم بھی ہو

امریکہ جنوری ۱۹۷۹ء

منظر

آسماں آج اِک بحرِ پُر شور ہے
جس میں ہر سُو رواں بادلوں کے جہاز
ان کے عرشے پہ کرنوں کے مستول ہیں
بادبانوں کی پہنے ہُوئے فرغلیں
نیل میں گنبدوں کے جزیرے کئی
ایک بازی میں مصروف ہے ہر کوئی
وہ ابابیل کوئی نہاتی ہُوئی
کوئی چیل غوطے میں جاتی ہوئی
کوئی طاقت نہیں اس میں زور آزما

کوئی بیڑا نہیں ہے کسی مُلک کا
اس کی تہ میں کوئی آبدوزیں نہیں
کوئی راکٹ نہیں، کوئی توپیں نہیں،
یُوں تو سارے عناصر ہیں یاں زور میں
امن کتنا ہے اِس بحرِ پُرشور میں

سمرقند ۱۹۷۸

قفقاز کے شاعر تاس تلی سے ماخوذ

شاعر لوگ

ہر اِک دَور میں، ہر زمانے میں ہم
زہر پیتے رہے، گیت گاتے رہے
جان دیتے رہے زندگی کے لیے
ساعتِ وصل کی سرخوشی کے لیے
دِین و دُنیا کی دَولت لُٹاتے رہے
فقر و فاقہ کا توشہ سنبھالے ہُوئے
جو بھی رستہ چُنا اُس پہ چلتے رہے
مال والے حقارت سے تکتے رہے
طعن کرتے رہے، ہاتھ ملتے رہے

ہم نے ان پر کیا حرفِ حق سنگ زن
جن کی ہیبت سے دُنیا لرزتی رہی۔
جن پہ آنسو بہانے کو کوئی نہ تھا
اپنی آنکھ اُن کے غم میں برستی رہی۔
سب سے اوجھل ہوئے حکمِ حاکم پہ ہم
قید خانے سہے، تازیانے سہے
لوگ سنتے رہے سازِ دِل کی صدا
اپنے نغمے سلاخوں سے چھنتے رہے
خُونچکاں دہر کا خُونچکاں آئینہ
دُکھ بھری خلق کا دُکھ بھرا دِل ہیں ہم
طبعِ شاعر ہے جنگاہِ عدل و ستم
مُنصفِ خیر و شر، حق و باطل ہیں ہم

لاؤ تو قتل نامہ مرا

سُننے کو بھیڑ ہے سرِ محشر لگی ہُوئی
تُہمت تمھارے عشق کی ہم پر لگی ہُوئی

رِندوں کے دم سے آتشِ مے کے بغیر بھی
ہے میکدے میں آگ برابر لگی ہُوئی

آباد کر کے شہرِ خموشاں ہر ایک سُو
کِس کھوج میں ہے تیغِ ستمگر لگی ہُوئی

آخر کو آج اپنے لہُو پر ہُوئی تمام
بازی میانِ قاتل و خنجر لگی ہُوئی

"لاؤ تو قتل نامہ مرا، مَیں بھی دیکھ لُوں
کِس کِس کی مُہر ہے سرِ محضر لگی ہُوئی"

آوازیں

ظالم

جشن ہے ماتمِ اُمّید کا آؤ لوگو
مرگِ انبوہ کا تہوار مناؤ لوگو
عدم آباد کو آباد کیا ہے مَیں نے
تم کو دن رات سے آزاد کیا ہے مَیں نے۔
جلوۂ صبح سے کیا مانگتے ہو
بسترِ خواب سے کیا چاہتے ہو
ساری آنکھوں کو تہِ تیغ کیا ہے مَیں نے
سارے خوابوں کا گلا گھونٹ دیا ہے مَیں نے۔
اب نہ لہکے گی کسی شاخ پہ پھُولوں کی حنا

فصلِ گُل آئے گی نمرُود کے انگار لیے

اب نہ برسات میں برسے گی گُہر کی برکھا

ابر آئے گا خس و خار کے انبار لیے۔

میرا مسلک بھی نیا، راہِ طریقت بھی نئی

میرے قانوں بھی نئے، میری شریعت بھی نئی

اب فقیہانِ حرم دستِ صنم چُومیں گے

سَرو قد مٹّی کے بَونوں کے قدم چُومیں گے

فرش پر آج درِ صدق و صفا بند ہوا

عرش پر آج ہر اِک بابِ دعا بند ہوا۔

مظلُوم

رات چھائی تو ہر اِک درد کے دھارے پھُوٹے

صبح پھُوٹی تو ہر اِک زخم کے ٹانکے ٹوٹے

دوپہر آئی تو ہر رگ نے لہو برسایا
دن ڈھلا، خوف کا عفریت مقابل آیا۔
یا خدا یہ مری گردانِ شب و روز و سحر
یہ مری عمر کا بے منزل و آرام سفر
کیا یہی کچھ مری قسمت میں لکھا ہے تو نے
ہر مسرت سے مجھے عاق کیا ہے تو نے۔
وہ یہ کہتے ہیں تو خوشنود ہر اک ظلم سے ہے
وہ یہ کہتے ہیں ہر اک ظلم ترے حکم سے ہے
گر یہ سچ ہے تو ترے عدل سے انکار کروں
اُن کی مانوں کہ تری ذات کا اقرار کروں

یہ ماتمِ وقت کی گھڑی ہے

ٹھہر گئی آسماں کی ندیا
وہ جا لگی ہے اُفق کنارے
اُداس رنگوں کی چاندنیا۔
اُتر گئے ساحلِ زمیں پر
سبھی کھویّا
تمام تارے۔
اُکھڑ گئی سانس پتّیوں کی
چلی گئیں اُونگھ میں ہوائیں
گجر بجا حکمِ خامشی کا
تو چُپ میں گُم ہو گئیں صدائیں۔

سحر کی گوری کی چھاتیوں سے
ڈھلک گئی تیرگی کی چادر
اور اس بجائے
بکھر گئے اُس کے تن بدن پر
نراس تنہائیوں کے سائے
اور اس کو کچھ بھی خبر نہیں ہے۔
کسی کو کچھ بھی خبر نہیں ہے
کہ دن ڈھلے شہر سے نکل کر
کدھر کو جانے کا رُخ کیا تھا
نہ کوئی جادہ، نہ کوئی منزل
کسی مسافر کو
اب دماغِ سفر نہیں ہے۔

یہ وقت زنجیرِ روز و شب کی
کہیں سے ٹوٹی ہوئی کڑی ہے
یہ ماتمِ وقت کی گھڑی ہے

یہ وقت آئے تو بے ارادہ
کبھی کبھی مَیں بھی دیکھتا ہُوں
اُتار کر ذات کا لبادہ
کہیں سیاہی ملامتوں کی
کہیں پہ گُل بُوٹے اُلفتوں کے
کہیں لکیریں ہیں آنسوؤں کی
کہیں پہ خُونِ جگر کے دھبّے

یہ چاک ہے پنجۂ عدو کا
یہ مہر ہے یارِ مہرباں کی
یہ لعل لبہائے مہوشاں کے
یہ مرحمت ہے شیخِ بد زباں کی
یہ جامۂ روز و شب گزیدہ
مجھے یہ پیراہنِ دریدہ
عزیز بھی، ناپسند بھی ہے۔
کبھی یہ فرمانِ جوشِ وحشت
کہ نوچ کر اس کو پھینک ڈالو
کبھی یہ اصرارِ حرفِ اُلفت
کہ چوم کر پھر گلے لگا لو۔

ہم تو مجبورِ وفا ہیں

تُجھ کو کتنوں کا لہُو چاہیئے اے ارضِ وطن
جو ترے عارضِ بے رنگ کو گُلنار کریں
کتنی آہوں سے کلیجہ ترا ٹھنڈا ہو گا
کتنے آنسُو ترے صحراؤں کو گُلزار کریں

تیرے ایوانوں میں پُرزے ہُوئے پیماں کتنے
کتنے وعدے جو نہ آسودۂ اقرار ہُوئے
کتنی آنکھوں کو نظر کھا گئی بدخواہوں کی
خواب کتنے تری شاہراہوں میں سنگسار ہُوئے

"بلاکشانِ محبت پہ جو ہوا سو ہوا
جو مجھ پہ گزری مت اُس سے کہو، ہُوا سو ہُوا

مبادا ہو کوئی ظالم ترا گریباں گیر
لہُو کے داغ تو دامن سے دھو، ہوا سو ہوا

ہم تو مجبورِ وفا ہیں، مگر اے جانِ جہاں
اپنے عشّاق سے ایسے بھی کوئی کرتا ہے
تیری محفل کو خدا رکھے ابد تک قائم
ہم تو مہماں ہیں گھڑی بھر کے، ہمارا کیا ہے

پیرس

دِن ڈھلا، کُوچہ و بازار میں صف بستہ ہُوئیں

زرد رُو روشنیاں۔

اِن میں ہر ایک کے کشکول سے برسیں رم جھم

اِس بھرے شہر کی ناسُودگیاں۔

دُور پس منظرِ افلاک میں دُھندلانے لگے

عظمتِ رفتہ کے نشاں۔

پیش منظر میں

کِسی سایۂ دِیوار سے لپٹا ہوا سایہ کوئی

دُوسرے سائے کی موہوم سی اُمید لیے

زیرِ لب شامِ گذشتہ کی طرح

شرحِ بے دردیٔ ایام کی تمہید لیے۔
اور کوئی اجنبی
اِن روشنیوں، سایوں سے کتراتا ہوا
اپنے بے خواب شبستاں کی طرف جاتا ہوا۔

قوّالی

جلا پھر صبر کا خرمن، پھر آہوں کا دُھواں اُٹّھا

ہُوا پھر نذرِ صرصر ہر نشیمن کا ہر اِک تنکا

ہُوئی پھر صبحِ ماتم آنسوؤں سے بھر گئے دریا

چلا پھر سُوئے گردوں کاروانِ نالۂ شبہا

ہر اِک جانب فضا میں پھر مچا کُہرام یارَبّا

اُمنڈ آئی کہیں سے پھر گھٹا وحشی زمانوں کی

فضا میں بجلیاں لہرائیں پھر سے تازیانوں کی

قلم ہونے لگی گردن قلم کے پاسبانوں کی

کُھلا نیلام ذہنوں کا، لگی بولی زبانوں کی

لہُو دینے لگا ہر اِک دہن میں بخیۂ لبہا

چلا پھر سوئے گردوں کاروانِ نالۂ شبہا

ستم کی آگ کا ایندھن بنے دِل پھر سے وا دلہا!

یہ تیرے سادہ دِل بندے کِدھر جائیں خُداوندا

بنا پھرتا ہے ہر اک مدّعی پیغام بر تیرا

ہر اِک بُت کو صنم خانے میں دعویٰ ہے خُدائی کا

خُدا محفوظ رکھے از خُداوندانِ مذہب ہا

چلا پھر سوئے گردوں کاروانِ نالۂ شب ہا

کیا کریں

مری تری نگاہ میں
جو لاکھ اِنتظار ہیں
جو میرے تیرے تن بدن میں
لاکھ دِل فگار ہیں
جو میری تیری اُنگلیوں کی بے حسی سے
سب قلم نزار ہیں،
جو میرے تیرے شہر کی
ہر اِک گلی
میں میرے تیرے نقشِ پا کے بے نشاں مزار ہیں
جو میری تیری رات کے

ستارے زخم زخم ہیں
جو میری تیری صبح کے
گلاب چاک چاک ہیں
یہ زخم سارے بے دوا
یہ چاک سارے بے رفو۔
کسی پہ راکھ چاند کی
کسی پہ اوس کا لہو،
یہ ہے بھی یا نہیں، بتا
یہ ہے کہ محض جال ہے
مرے تمہارے عنکبوتِ وہم کا بُنا ہوا۔
جو ہے تو اس کا کیا کریں؟

نہیں ہے تو بھی کیا کریں؟
بتا، بتا،
بتا، بتا۔

دو نظمیں فلسطین کے لیے

فلسطینی شہدا جو پردیس میں کام آئے

مَیں جہاں پر بھی گیا ارضِ وطن

تیری تذلیل کے داغوں کی جلن دِل میں لیے

تیری حُرمت کے چراغوں کی لگن دِل میں لیے

تیری اُلفت، تری یادوں کی کسک ساتھ گئی

تیرے نارنج شگوفوں کی مہک ساتھ گئی

سارے اَن دیکھے رفیقوں کا جِلَو ساتھ رہا

کتنے ہاتھوں سے ہم آغوش مرا ہاتھ رہا

دُور پردیس کی بے مہر گزرگاہوں میں

اجنبی شہر کی بے نام و نشاں راہوں میں

جس زمیں پر بھی کھُلا میرے لہُو کا پرچم
لہلہاتا ہے وہاں ارضِ فلسطیں کا علَم
تیرے اعدا نے کیا ایک فلسطیں برباد
میرے زخموں نے کیے کتنے فلسطیں آباد

بیروت ۱۹۸۰ء

فلسطینی بچّے کے لیئے لوری

مت رو بچّے
رو رو کے ابھی
تیری امّی کی آنکھ لگی ہے۔
مت رو بچّے
کچھ ہی پہلے
تیرے ابّا نے
اپنے غم سے رُخصت لی ہے۔
مت رو بچّے
تیرا بھائی
اپنے خواب کی تتلی پیچھے

دُور کہیں پردیس گیا ہے۔

مت رو بچّے

تیری باجی کا

ڈولا پرائے دیس گیا ہے۔

مت رو بچّے

تیرے آنگن میں

مُردہ سُورج نہلا کے گئے ہیں

چندرما دفنا کے گئے ہیں۔

مت رو بچّے

گر تُو روئے گا تو یہ سب

امّی، ابّا، باجی، بھائی، چاند اور سُورج

اور بھی تجھ کو رُلوائیں گے۔

تو مُسکائے گا تو شاید
سارے اِک دن بھیس بدل کر
تُجھ سے کھیلنے لوٹ آئیں گے۔

نذرِ حافظ

ناصحم گُفت بجُز غم چہ ہُنر دارد عشق
برو اے خواجۂ عاقل ہُنرے بہتر ازین

قندِ دہن، کچھ اِس سے زیادہ
لُطفِ سخن، کچھ اِس سے زیادہ
فصلِ خزاں میں مُشکِ بہاراں
برگِ سمن، کچھ اِس سے زیادہ
حالِ چمن پر تلخ نوائی
مُرغِ چمن، کچھ اِس سے زیادہ
دِل شِکنی بھی، دِلداری بھی
یادِ وطن، کچھ اِس سے زیادہ

شمعِ بدن ، فانُوسِ قبا میں
خُوبیِ تن کچُھ اِس سے زیادہ
عشق میں کیا ہے غم کے علاوہ
خواجہؔ من کچُھ اِس سے زیادہ

میرے ملنے والے

وہ در کھلا میرے غمکدے کا
وہ آ گئے میرے ملنے والے
وہ آ گئی شام، اپنی راہوں میں
فرشِ افسردگی بچھانے
وہ آ گئی رات چاند تاروں کو
اپنی آزردگی سنانے
وہ صبح آئی، دمکتے نشتر سے
یاد کے زخم کو منانے۔

وہ دوپہر آئی، آستیں میں
چھپائے شعلوں کے تازیانے

یہ آئے سب میرے ملنے والے
کہ جن سے دِن رات واسطہ ہے۔
یہ کون کب آیا، کب گیا ہے
نگاہ و دِل کو خبر کہاں ہے،
خیال سوئے وطن رواں ہے
سمندروں کی ایال تھامے
ہزار وہم و گماں سنبھالے
کئی طرح کے سوال تھامے۔

بیروت ۱۹۸۰ء

گاؤں کی سڑک

یہ دیس مُفلس و نادار کج کلاہوں کا
یہ دیس بے زر و دینار بادشاہوں کا
کہ جس کی خاک میں قدرت ہے کیمیائی کی
یہ نائبانِ خُداوندِ ارض کا مسکن
یہ نیک پاک بزرگوں کی رُوح کا مدفن
جہاں پہ چاند ستاروں نے جبہہ سائی کی۔
نہ جانے کتنے زمانوں سے اس کا ہر رستہ
مثالِ خانۂ بے خانماں تھا در بستہ۔
خوشا کہ آج بفضلِ خُدا وہ دِن آیا
کہ دستِ غیب نے اِس گھر کی در کُشائی کی۔

چُنے گئے ہیں سبھی خار اِس کی راہوں سے
سُنی گئی ہے بالآخر برہنہ پائی کی

بیروت ۱۹۸۰ء

میرے دیس کے نونہالوں کے نام

وہ غنچے جو شبنم کی اِک بوند
کِھلکِھلانے کی اُمید دے کر
ہمیشہ ترستے رہے
وہ لعل و گُہر
جنہیں گُدڑیوں کے اندھیرے سے باہر
چمکتے ہوئے دن کی ہر اِک کِرن
جگمگانے سے پہلو بچاتی رہی
جِن کے ننھے دِلوں کے کٹوروں میں
مہر و محبت کا رَس
کوئی ٹپکانے والا نہ تھا

جن کی محروم آنکھیں
ان کی ماؤں کی صُورت
مرے دیس کی ساری ماؤں کی صُورت
آنے والے دنوں میں
ہنسی کے اُجالے کی رہ تک رہی ہیں

جو میرا تمہارا رِشتہ ہے

میں کیا لکھوں کہ جو میرا تمہارا رشتہ ہے
وہ عاشقی کی زباں میں کہیں بھی درج نہیں
لکھا گیا ہے بہت لُطفِ وصل و دردِ فراق
مگر یہ کیفیت اپنی رقم نہیں ہے کہیں
یہ اپنا عشق ہم آغوش جس میں ہجر و وصال
یہ اپنا درد کہ ہے کب سے ہمدمِ مہ و سال
اِس عشقِ خاص کو ہر ایک سے چھپائے ہوئے
"گزر گیا ہے زمانہ گلے لگائے ہوئے"

اور پھر ایک دن یوں خزاں آ گئی

اور پھر ایک دِن یوں خزاں آ گئی
آبنوسی تنوں کے برہنہ شجر
سرنگوں صف بہ صف پیشِ دیوار و در
اور چاروں طرف اِن کے بکھرے ہوئے
زرد پتّے دِلوں کے سرِ رہگذر
جس نے چاہا وہ گزرا اِنہیں روند کر
اور کسی نے ذرا سی فغاں بھی نہ کی
ان کی شاخوں سے خوابوں، خیالوں کے سب نغمہ گر
جن کی آواز گردن کا پھندا بنی

جس سے جس دم وہ نا آشنا ہو گئے
آپ ہی آپ سب خاک میں آ گرے
اور صیّاد نے زہ کماں بھی نہ کی
اے خدائے بہاراں ذرا رحم کر
ساری مُردہ رگوں کو نمو بخش دے
سارے تشنہ دلوں کو لہو بخش دے
کوئی اک پیڑ پھر لہلہانے لگے
کوئی اِک نغمہ گر چہچہانے لگے

یہ کس دیارِ عدم میں

نہیں ہے یُوں تو نہیں ہے کہ اب نہیں پیدا
کِسی کے حُسن میں شمشیرِ آفتاب کا حُسن
نگاہ جِس سے ملاؤ تو آنکھ دُکھنے لگے

کِسی ادا میں ادائے خرامِ بادِ صبا
جِسے خیال میں لاؤ تو دل سُلگنے لگے

لیئے ہے اب بھی الاؤ کہیں وہ رنگِ بدن
حجاب تھا جو کِسی تن کا پیرہن کی طرح
اُداس باہوں میں کھویا ہوا کوئی آغوش
کشادہ اب بھی ہے شاید درِ وطن کی طرح
نہیں ہے یُوں تو نہیں ہے کہ اب نہیں باقی

جہاں میں رزم گہِ حُسن و عشق کا میلا
بنائے لُطف و محبّت رواجِ مہر و وفا
یہ کِس دیارِ عدم کے مقیم ہیں ، ہم تم
کہ جِس میں مرحمتِ حسنِ رُوئے یار تو کیا
نویدِ رحمتِ دستِ قضا نہیں آتی
یہ کِس خُمار کدے میں ندیم ہیں ہم تم
کہ جِس میں شورشِ رندانِ مَے گُسار تو کیا
شکستِ شیشۂ دِل کی صدا نہیں آتی

(ناتمام)

ایک گیت درد کے نام

اے ہماری ساری راتوں کو
درد دینے والے
اور دِل جلانے والے
اے ہماری انکھڑیوں کو
بے خوابیوں کے ساغر
سرِ شب پلانے والے
کِسی رہگزر پہ اک دِن
بھیگی ہُوئی سحر میں
تو ہمیں کہیں مِلا تھا
اور ہم نے ترس کھا کر

اِک جام مُلتفت کا
اپنے دِل و جِگر کا
اِک مُضطرب سا گوشہ
تری نذر کر دیا تھا۔
وہ دِن اور آج کا دِن
اِک پَل کو ساتھ اپنا
تُو نے کبھی نہ چھوڑا
دُنیا کی وسعتوں میں
گلیوں میں، راستوں میں
تُو ساتھ ہے ہمارے
جس اُداس صُبح اِک دِن
تُو ہمیں کہیں مِلا تھا

اے کاش ہم نے تجھ کو
کچھ بھی دیا نہ ہوتا
اے دِل جلانے والے
بے خوابیوں کے ساغر
ہم کو پلانے والے۔

عشق اپنے مجرموں کو پابجولاں لیے چلا

دار کی رسیوں کے گلوبند گردن میں پہنے ہوئے
گانے والے ہر اک روز گاتے رہے
پائلیں بیڑیوں کی بجاتے ہوئے
ناچنے والے دُھومیں مچاتے رہے۔
ہم جو نہ اِس صف میں تھے اور نہ اُس صف میں تھے
راستے میں کھڑے ان کو تکتے رہے
رشک کرتے رہے
اور چُپ چاپ آنسو بہاتے رہے۔
لوٹ کر آکے دیکھا تو پھولوں کا رنگ
جو کبھی سُرخ تھا زرد ہی زرد ہے

اپنا پہلو ٹٹولا تو ایسا لگا

دِل جہاں تھا وہاں درد ہی درد ہے۔

گلے میں کبھی طوق کا واہمہ

کبھی پاؤں میں لمسِ زنجیر کا

اور پھر ایک دِن عشق اُنہیں کی طرح

رَسن در گلو، پا بجولاں ہمیں

اِسی قافلے میں کشاں لے چلا۔

بیروت ۱۹۸۱ء

آج شب کوئی نہیں ہے

آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے
آنکھ سے دُور طلسمات کے در وا ہیں کئی
خواب در خواب محلات کے در وا ہیں کئی
اور مکیں کوئی نہیں ہے
آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے
"کوئی نغمہ، کوئی خوشبو، کوئی کافر صورت"
کوئی اُمید، کوئی آس مسافر صورت
کوئی غم، کوئی کسک، کوئی شک، کوئی یقیں
کوئی نہیں ہے
آج شب دِل کے قریں کوئی نہیں ہے۔

تم اگر ہو تو مرے پاس ہو یا دُور ہو تُم
ہر گھڑی سایہ گرِ خاطرِ رنجور ہو تُم
اور نہیں ہو تو کہیں کوئی نہیں، کوئی نہیں ہے
آج شب دل کے قریں کوئی نہیں ہے

راکھ اور پھُول

آج پھر درد و غم کے دھاگے میں
ہم پرو کر ترے خیال کے پھُول
ترکِ اُلفت کے دشت سے چُن کر
آشنائی کے ماہ و سال کے پھُول
تیری دہلیز پر سجا آئے
پھر تری یاد پر چڑھا آئے
باندھ کر آرزو کے پلّے میں
ہجر کی راکھ اور وصال کے پھُول

جب دُکھ کی ندیا میں ہم نے
جیوَن کی ناوَ ڈالی تھی
تھا کتنا کَس بَل باہوں میں
لوہُو میں کتنی لالی تھی
یوں لگتا تھا دو ہاتھ لگے
اور ناوَ پُورم پار لگی۔
ایسا نہ ہوا، ہر دھارے میں
کچھ اَن دیکھی منجداریں تھیں
کچھ مانجھی تھے اَن جان بہت
کچھ اَن پَرکھی پتواریں تھیں

اب جو بھی چاہو چھان کرو
اب چاہو کتنے دوش دھرو
ندیا تو وہی ہے ناؤ وہی،
اب تم ہی کہو کیا کرنا ہے
اب کیسے پار اترنا ہے؟

جب ہم نے اپنی چھاتی میں
اِس دیس کے گھاؤ دیکھے تھے
تھا ویدوں پر وشواش بہت
اور یاد بہت سے نسخے تھے
یوں لگتا تھا بس دو دن میں
ساری بپتا کٹ جائے گی

اور سب گھاؤ بھر جائیں گے۔

ایسا نہ ہوا کہ روگ اپنے

تو صدیوں ڈھیر پرانے تھے

وید اِن کی تہ کو پا نہ سکے

اور ٹوٹکے سب ناکام گئے۔

اب جو بھی چاہو چھان کرو

اب چاہے کتنے دوش دھرو

چھاتی تو وہی ہے گھاؤ وہی

اب تم ہی کہو کیا کرنا ہے

یہ گھاؤ کیسے بھرنا ہے؟

بیروت مئی ۱۹۸۲ء

متفرق کلام

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی

جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آجائے

جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم

جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آجائے

جولائی ۱۹۲۹ء

دل رہینِ غمِ جہاں ہے آج

ہر نفس تشنۂ فغاں ہے آج

سخت ویراں ہے محفلِ ہستی

اے غمِ دوست تو کہاں ہے آج

مارچ ۱۹۳۰ء

وقفِ حرمان و یاس رہتا ہے

دل ہے، اکثر اداس رہتا ہے

تم تو غم دے کے بھول جاتے ہو

مجھ کو احساں کا پاس رہتا ہے

جون ۱۹۳۱ء

فضائے دل پر اُداسی بکھرتی جاتی ہے

فسردگی ہے کہ جاں تک اترتی جاتی ہے

فریبِ زیست سے قدرت کا مُدّعا معلوم

یہ ہوش ہے کہ جوانی گزرتی جاتی ہے

جنوری ۱۹۳۲ء

متاعِ لوح و قلم چھن گئی تو کیا غم ہے
کہ خونِ دل میں ڈبو لی ہیں اُنگلیاں میں نے
زباں پہ مُہر لگی ہے تو کیا کہ رکھ دی ہے
ہر ایک حلقۂ زنجیر میں زباں میں نے

ستمبر ۱۹۵۲ء

نہ پُوچھ جب سے ترا انتظار کتنا ہے
کہ جن دنوں سے مجھے تیرا انتظار نہیں
ترا ہی عکس ہے اُن اجنبی بہاروں میں
جو تیرے لب، ترے بازو، ترا کنار نہیں

جون ۱۹۵۰ء

صبا کے ہاتھ میں نرمی ہے ان کے ہاتھوں کی
ٹھہر ٹھہر کے یہ ہوتا ہے آج دل کو گماں
وہ ہاتھ ڈھونڈ رہے ہیں بساطِ محفل میں
کہ دل کے داغ کہاں ہیں نشستِ درد کہاں

اگست ۱۹۵۰ء

پھر حشر کے ساماں ہوئے ایوانِ ہوس میں
بیٹھے ہیں ذوی العدل، گنہگار کھڑے ہیں
ہاں جرمِ وفا دیکھیے کس کس پہ ہے ثابت
وہ سارے خطاکار سرِ دار کھڑے ہیں

مئی ۱۹۵۱ء

ترا جمال نگاہوں میں لے کے اُٹھا ہوں
نکھر گئی ہے فضا تیرے پیرہن کی سی
نسیم تیرے شبستاں سے ہو کے آئی ہے
مری سحر میں مہک ہے ترے بدن کی سی

جون ۱۹۵۱ء

ہمارے دم سے ہے کوئے جنوں میں اب بھی خجل
عبائے شیخ و قبائے امیر و تاجِ شہی
ہمیں سے سُنتِ منصور و قیس زندہ ہے
ہمیں سے باقی ہے گل دامنی و کج کلہی

نومبر ۱۹۵۱ء

میخانے کی رونق ہیں کبھی خانقہوں کی
اپنا لی ہوس والوں نے جو رسم چلی ہے
دلدارئ واعظ کو ہمیں باقی ہیں ورنہ
اب شہر میں ہر رندِ خرابات ولی ہے

جولائی ۱۹۵۷ء

نہ آج لطف کر اتنا کہ کل گزر نہ سکے
وہ رات جو کہ ترے گیسوؤں کی رات نہیں
یہ آرزو بھی بڑی چیز ہے مگر ہمدم
وصالِ یار فقط آرزو کی بات نہیں

نومبر ۱۹۵۳ء

فکرِ سود و زیاں تو چھوٹے گی
منّتِ این و آں تو چھوٹے گی
خیر، دوزخ میں مے ملے نہ ملے
شیخ صاحب سے جاں تو چھوٹے گی

مئی ۱۹۵۴ء

صبح پھوٹی تو آسماں پہ ترے
رنگِ رُخسار کی پھُوہار گری
رات چھائی تو رُوئے عالم پر
تیری زُلفوں کی آبشار گری

جنوری ۱۹۵۵ء

تمام شب دلِ وحشی تلاش کرتا ہے
ہر اِک صدا میں ترے حرفِ لُطف کا آہنگ
ہر ایک صبح مِلاتی ہے بار بار نظر
ترے دہن سے ہر اک لالہ و گلاب کا رنگ

مارچ ۱۹۵۶ء

تمہارے حسن سے رہتی ہے ہمکنار نظر
تمہاری یاد سے دِل ہمکلام رہتا ہے
رہی فراغتِ ہجراں تو ہو رہے گا طے
تمہاری چاہ کا جو جو مقام رہتا ہے

۱۹۵۱ حیدرآباد جیل

کھلے جو ایک دریچے میں آج حُسن کے پھول
تو صبح جھوم کے گُلزار ہو گئی یکسر،
جہاں کہیں بھی گِرا نُور اُن نگاہوں سے
ہر ایک چیز طرحدار ہو گئی یکسر

جناح ہسپتال کراچی

رات ڈھلنے لگی ہے سینوں میں
آگ سُلگاوٗ آبگینوں میں
دلِ عُشّاق کی خبر لینا
پھول کھلتے ہیں ان مہینوں میں

مارچ ۱۹۵۸ء

یہ خوں کی مہک ہے کہ لبِ یار کی خوشبو
کس راہ کی جانب سے صبا آتی ہے دیکھو
گلشن میں بہار آئی کہ زنداں ہوا آباد
کس سمت سے نغموں کی صدا آتی ہے دیکھو

فروری ۱۹۵۷ء

آج تنہائی کسی ہمدمِ دیریں کی طرح
کرنے آئی ہے مری ساقی گری شام ڈھلے
منتظر بیٹھے ہیں ہم دونوں کہ مہتاب ابھرے
اور ترا عکس جھلکنے لگے ہر سائے تلے

اپریل ۱۹۵۸ء

نہ دید ہے نہ سخن، اب نہ حرف ہے نہ پیام
کوئی بھی حیلۂ تسکیں نہیں اور آس بہت ہے
اُمیدِ یار، نظر کا مزاج، درد کا رنگ
تم آج کچھ بھی نہ پوچھو کہ دل اُداس بہت ہے

جنوری ۱۹۵۸ء

ہم خستہ تنوں سے محتسبو کیا مال منال کا پوچھتے ہو
جو عمر سے ہم نے بھر پایا سب سامنے لائے دیتے ہیں
دامن میں ہے مشتِ خاکِ جگر، ساغر میں ہے خونِ حسرتِ مے
لو ہم نے دامن جھاڑ دیا، لو جام اُلٹائے دیتے ہیں

قلعۂ لاہور مارچ ۱۹۵۹ء

آ گئی فصلِ سکوں چاک گریباں والو
سِل گئے ہونٹ، کوئی زخم سِلے یا نہ سِلے
دوستو بزم سجاؤ کہ بہار آئی ہے
کھِل گئے زخم، کوئی پھول کھِلے یا نہ کھِلے

اپریل ۱۹۵۹ء

ڈھلتی ہے موجِ مے کی طرح رات ان دِنوں
کھِلتی ہے صبح گُل کی طرح رنگ و بُو سے پُر
ویراں ہیں جام پاس کرو کچھ بہار کا
دل آرزو سے پُر کرو، آنکھیں لہو سے پُر

فروری ۱۹۵۹ء

ان دنوں رسم و رہِ شہرِ نگاراں کیا ہے
قاصدا، قیمتِ گلگشتِ بہاراں کیا ہے
کوئے جاناں ہے کہ مقتل ہے کہ میخانہ ہے
آج کل صورتِ بربادیِ یاراں کیا ہے

جون ۱۹۶۸ء

ادائے حسن کی معصومیت کو کم کر دے
گناہ گارِ نظر کو حجاب آتا ہے

زنداں زنداں شورِ اناالحق، محفل محفل قلقلِ مے

خونِ تمنا دریا دریا، دریا دریا عیش کی لہر

دامن دامن رُت پھولوں کی، آنچل آنچل اشکوں کی

قریہ قریہ جشن بپا ہے ماتم شہر بہ شہر

کراچی۔ جنوری ۱۹۶۵ء

(گلاب کا پھول سابق صدر ایوب خاں کا انتخابی نشان تھا)

دیدۂ تر پہ وہاں کون نظر کرتا ہے

کاسۂ چشم میں خوں نابِ جگر لے کے چلو

اب اگر جاؤ پئے عرض و طلب اُن کے حضور

دست و کشکول نہیں کاسۂ سر لے کے چلو

کراچی۔ جنوری ۱۹۶۵ء

دیوارِ شب اور عکسِ رُخِ یار سامنے
پھر دل کے آئینے سے لہو پھوٹنے لگا
پھر وضعِ احتیاط سے دُھندلا گئی نظر
پھر ضبطِ آرزو سے بدن ٹوٹنے لگا

جون ۱۹۶۶ء

ضبط کا عہد بھی ہے شوق کا پیماں بھی ہے
عہد و پیماں سے گزر جانے کو جی چاہتا ہے
درد اتنا ہے کہ ہر رگ میں ہے محشر برپا
اور سکوں ایسا کہ مر جانے کو جی چاہتا ہے

اگست ۱۹۶۸ء

بالیں پہ کہیں رات ڈھل رہی ہے
یا شمع پگھل رہی ہے
پہلو میں کوئی چیز جل رہی ہے
تم ہو کہ مری جاں نکل رہی ہے

مئی ۱۹۷۰ء

اِک سخن مطربِ زیبا کہ سُلگ اُٹھے بدن
اِک قدح ساقیٔ مہوش جو کرے ہوش تمام

ذکرِ صبحے کہ رُخِ یار سے رنگیں تھا چمن
یادِ شبہا کہ تنِ یار تھا آغوش تمام

جون ۱۹۷۰ء

یار اغیار ہو گئے ہیں،
اور اغیار مُصر ہیں کہ وہ سب
یارِ غار ہو گئے
اب کوئی ندیم باصفا نہیں ہے
سب رندِ شراب خوار ہو گئے ہیں

اگست ۱۹۸۱ء

جو پیرہن میں کوئی تار محتسب سے بچا
دراز دستیِ پیرِ مغاں کی نذر ہوا
اگر جراحتِ قاتل سے بخشوا لائے
تو دل سیاستِ چارہ گراں کی نذر ہوا

مارچ ۷۱ء

ہزار دردِ شبِ آرزو کی راہ میں ہے
کوئی ٹھکانہ بتاؤ کہ قافلہ اترے
قریب اور بھی آؤ کہ شوقِ دید مٹے
شراب اور پلاؤ کہ کچھ نشہ اُترے

جنوری ۱۹۷۲ء

دُور جا کر قریب ہو جتنے
ہم سے کب تم قریب تھے اِتنے
اب نہ آؤ گے تُم نہ جاؤ گے
وصل و ہجراں بہم ہوئے کِتنے

بیروت ۷۸ء

مقتل میں نہ مسجد نہ خرابات میں کوئی
ہم کس کی اَمانت میں غمِ کارِ جہاں دیں
شاید کوئی ان میں سے کفن پھاڑ کے نکلے
اب جائیں شہیدوں کے مزاروں پہ اذاں دیں

بیروت ۷۹ء

ہم اپنے وقت میں گزرے جہانِ گزراں سے
نظر میں رات لیے دل میں آفتاب لیے
ہم اپنے وقت پہ پہنچے حضورِ یزداں میں
زباں پہ حمد لیے ہاتھ میں شراب لیے

بیروت ۱۹۸۱ء

اپنے انعامِ حُسن کے بدلے
ہم تہی دامنوں سے کیا لینا
آج فرقت زدوں پہ لطف کرو
پھر کبھی صبر آزما لینا

بیروت ۱۹۸۲ء

برکھا برسے چھت پر، مَیں تیرے سپنے دیکھوں
برف گرے پربت پر، مَیں تیرے سپنے دیکھوں

صُبح کی نیل پری مَیں تیرے سپنے دیکھوں
کوئل دُھوم مچائے مَیں تیرے سپنے دیکھوں

آئے اور اُڑ جائے مَیں تیرے سپنے دیکھوں
باغوں میں پتّے مہکیں مَیں تیرے سپنے دیکھوں

شبنم کے موتی دہکیں، مَیں تیرے سپنے دیکھوں
اس پیار میں کوئی دھوکا ہے

تو نار نہیں کچھ اور ہے شے
ورنہ کیوں ہر ایک سے

میں تیرے سپنے دیکھوں

بھائی

آج سے بارہ برس پہلے بڑا بھائی مرا
اسٹلین گراڈ کی جنگاہ میں کام آیا تھا

میری ماں اب بھی لیے پھرتی ہے پہلو میں یہ غم
جب سے اب تک ہے وہی تن پہ ردائے ماتم

اور اس دُکھ سے مری آنکھ کا گوشہ تر ہے
اب مری عمر بڑے بھائی سے کچُھ بڑھ کر ہے

داغستانی خاتون اور شاعر

اِس نے جب بولنا نہ سیکھا تھا
اِس کی ہر بات میں سمجھتی تھی

اب وہ شاعر بنا ہے نامِ خُدا
لیکن افسوس کوئی بات اس کی

میرے پلّے ذرا نہیں پڑتی

بہ نوکِ شمشیر

میرے آبا، کہ تھے نامحرمِ طوق و زنجیر
وہ مضامیں جو ادا کرتا ہے اب میرا قلم

نوکِ شمشیر پہ لکھتے تھے بہ نوکِ شمشیر
روشنائی سے جو مَیں کرتا ہوں کاغذ پہ رقم

سنگ و صحرا پہ وہ کرتے تھے لہُو سے تحریر

آرزُو

مجُھے معجزوں پہ یقیں نہیں مگر آرزُو ہے کہ جب قضا
مجُھے بزمِ دہر سے لے چلے
تو پھِر ایک بار یہ اِذن دے
کہ لحد سے لَوٹ کے آسکوں
ترے دَر پہ آکے صدا کروں
تُجھے غمگسار کی ہو طلب تو ترے حضُور میں آ رہوں
یہ نہ ہو تو سُوئے رہِ عدم میں پھِر ایک بار روانہ ہوں

سالگرہ

شاعر کا جشنِ سالگرہ ہے، شراب لا
منصب، خطاب، رُتبہ، انہیں کیا نہیں مِلا

بس نقص ہے تو اِتنا کہ ممدُوح نے کوئی
مِصرع کِسی کِتاب کے شایاں نہیں لکھا

ایک چٹان کے لئے کتبہ

جواں مردی اسی رفعت پہ پہنچی
جہاں سے بُزدلی نے جست کی تھی

تیرگی جال ہے اور بھالا ہے نُور
اِک شکاری ہے دن، اک شکاری ہے رات
جگ سمندر ہے جس میں کنارے سے دُور
مچھلیوں کی طرح اِبنِ آدم کی ذات
جگ سمندر ہے ساحِل پہ ہیں ماہی گیر
جال تھامے کوئی، کوئی بھالا لیے
میری باری کب آئے گی کیا جانئے
دِن کے بھالے سے مُجھ کو کریں گے شکار
رات کے جال میں یا کریں گے اسیر

نسخۂ اُلفت مِرا

گر کسی طور ہر اک اُلفتِ جاناں کا خیال
شعر میں ڈھل کے ثنائے رُخِ جانانہ بنے
پھر تو یوں ہو کہ مِرے شعر و سخن کا دفتر
طُول میں طُولِ شبِ ہجر کا افسانہ بنے
ہے بہت تشنہ مگر نسخۂ اُلفت میرا
اِس سبب سے کہ ہر اِک لمحۂ فرصت میرا
دِل یہ کہتا ہے کہ ہو قُربتِ جاناں میں بسر

شوپین کا نغمہ بجتا ہے

چھلنی ہے اندھیرے کا سینہ، برکھا کے بھالے برسے ہیں
دیواروں کے آنسو ہیں رواں، گھر خاموشی میں ڈوبے ہیں
پانی میں نہائے ہیں بوٹے،
گلیوں میں ہُو کا پھیرا ہے
شوپین کا نغمہ بجتا ہے

اِک غمگیں لڑکی کے چہرے پر چاند کی زردی چھائی ہے
جو برف گری تھی اس پہ لہُو کے چھینٹوں کی رُشنائی ہے
خوں کا ہر داغ دمکتا ہے
شوپین کا نغمہ بجتا ہے

کچھ آزادی کے متوالے، جاں کف پہ لیے میداں میں گئے
ہر سُو دشمن کا نرغہ تھا، کچھ بچ نکلے، کچھ کھیت رہے
عالم میں ان کا شہرہ ہے
شوپیں کا نغمہ بجتا ہے

اِک کُونج کو سکھیاں چھوڑ گئیں آکاش کی نیلی راہوں میں
وہ یاد میں تنہا روتی تھی، لپٹائے اپنی باہوں میں
اک شاہیں اُس پہ جھپٹا ہے
شوپیں کا نغمہ بجتا ہے

غم نے سانچے میں ڈھالا ہے
اِک باپ کے پتھر چہرے کو
مُردہ بیٹے کے ماتھے کو
اِک ماں نے رو کر چُوما ہے

شوپیں کا نغمہ بجتا ہے،
پھر پھولوں کی رُت لوٹ آئی
اور چاہنے والوں کی گردن میں جھُولے ڈالے باہوں نے
پھر جھرنے ناچے چھن چھن چھن چھن
اب بادل ہے نہ برکھا ہے
شوپیں کا نغمہ بجتا ہے

اَج لاہ اللے جے مِٹھڑے یار میرے

اَج آ ویہڑے وچھڑے یار میرے

فجر ہووے تے آکھیے بسم اللہ

اَج دولتاں ساڈے گھر آئیاں نیں

جیہدے قول تے اساں وساہ کیتا

اوہنے اوڑک توڑ نبھائیاں نیں

۱۹۷۱ء

گیت

کدھرے نہ پَیندیاں دساں
وے پردیسیا تیریاں
کاگ اڈاواں ، شگن مناواں
وگدی وا دے ترلے پاواں
تری یاد پَوے تے رواں
ترا ذکر کراں تے ہساں
کدھرے نہ پَیندیاں دساں
وے پردیسیا تیریاں

درد نہ دساں گھلدی جاواں
راز نہ کھولاں تکدی جاواں

کس نوں دل دے داغ دکھاواں

کس در اَگے جھولی ڈاہواں

دے ہیں کس دا دامن کھتساں

کدھرے نہ پیندیاں دساں

وے پردیسیا تیریاں

شام اُڈیکاں، فجر اُڈیکاں

آکھیں تے ساری عمر اُڈیکاں

آنڈ گوانڈیں دیوے بلدے

ربا ساڈا چانن گھلدے

جگ وسدلے ہیں دی دَساں

کدھرے نہ پیندیاں دساں

وے پردیسیا تیریاں

۱۹۷۱ء

میری ڈولی شوہ دریا

(۱۹۷۳ء کے سیلاب زدوں کے امدادی فنڈ کے لیے لکھی گئی)

کل تائیں سانوں بابلا

تو رکھیا ہِک نال لا

سَت خیراں ساڈیاں منگیاں

جد جُھلی تتّی وا

اج کیکن ویہڑوں ٹوریا

کویں لاہے نی میرے چا

میرے گہنے نیل ہتھ پَیر دے

میری ڈولی شوہ دریا

اج لتھے سارے چا

میری ڈولی شَوہ دریا ۔

ناں رُہڑدیاں رُڑھ گیاں سدھراں

ناں روندیاں رُل گئے نیر

ناں ہُوسجے ہُونج کے سُئے گئے

میرے ہتھ دی لیکھ لکیر

میری پُچھنی نِک سواہ دی

میرا چولا لیر دلیر

لج پالن بُوہڑے بھین دی

کوئی کرماں والے ویر

میرا چولا لیر دلیر

میرے لتھے سارے چا

میری ڈولی شوہ دریا

سسّی مر کے جنتن ہو گئی

میں تر کے اُوتر حال

سن ہاڑے اِس مسکین دے

ربّا پورا کر سوال

مری جھوک وَستے، میرا دیر وَستے

فیر تیری رحمت نال

کوئی پُورا کرے سوال؛ ربّا

تیری رحمت نال،

میرے لئے سارے چا

میری ڈولی شوہ دریا

۱۹۷۴ء

ربا سچیا

ربا سچیا توں تاں آکھیا سی

جا اوئے بندیا جگ دا شاہ ہیں توں

ساڈیاں نعمتاں تیریاں دولتاں نیں

ساڈا نیب تے عالیجاہ ہیں توں

ایس لارے تے ٹور کد پچھیا ای

کیہ ایس نمانے تے بیتیاں نیں

کدی سار وی لئی اُو رب سائیاں

تیرے شاہ نال جگ کیہ کیتیاں نیں

کتے دھونس پولیس سرکار دی اے

کتے دھاندلی مال پٹوار دی اے

ایتھوں ہڈاں چ کلپے جان میری

جیویں پھاہی چ کونج کُرلاندی اے

چنگا شاہ بنایا ای رب سائیاں

پَوے کھاندیاں وار نہ آوندی اے

مینوں شاہی نئیں چاہیدی رب میرے

میں تے عزت دا ٹکر منگناں ہاں

مینوں تانگھ نئیں محلاں ماڑیاں دی

میں تے جیویں دی نکر منگناں ہاں

میری منیں تے تیریاں میں مناں

تیری سونہہ جے اک وی گل موڑاں

جے ایہہ مانگ نئیں پجدی تیں ربا

فیر میں جاواں تے رب کوئی ہور لوڑاں

۱۹۷۴ء

قطعہ

اَج رات اِک رات دی رات جی کے
اساں جگ ہزاراں جی لِتّا اے
اج رات امرت دے جام ورگوں
اینہاں ہتھاں نے یار نوں پی لِتّا اے

ناظمؔ حکمت*

زنداں سے ایک خط

مری جاں تجھ کو بتلاؤں، بہت نازک یہ نکتہ ہے

بدل جاتا ہے انساں جب مکاں اس کا بدلتا ہے

مجھے زنداں میں پیار آنے لگا ہے اپنے خوابوں پر

جو شب کو نیند اپنے مہرباں ہاتھوں سے

وا کرتی ہے در اس کا

تو آ گرتی ہے ہر دیوار اس کی میرے قدموں پر۔

میں ایسے غرق ہو جاتا ہوں اُس دم اپنے خوابوں میں

کہ جیسے اک کرن ٹھہرے ہوئے پانی پہ گرتی ہے

---

* ترکی کا شہرۂ آفاق شاعر جس نے پہلی جنگ عظیم کے دوران ترکی کی جنگِ حریت میں حصہ لیا اور بعد میں بیشتر عمر قید و بند اور جلاوطنی میں گزاری۔ ۶۳ء میں وفات پائی۔

میں ان لمحوں میں کتنا سرخوش و دلشاد پھرتا ہوں
جہاں کی جگمگاتی وسعتوں میں کس قدر آزاد پھرتا ہوں
جہاں درد و الم کا نام ہے کوئی نہ زنداں ہے
تو پھر بیدار ہونا کس قدر تم پر گراں ہوگا ؟"
نہیں ایسا نہیں ہے میری جاں! میرا یہ قصہ ہے
میں اپنے عزم و ہمت سے
وہی کچھ بخشتا ہوں نیند کو جو اس کا حصہ ہے۔

ویرا کے نام٭

اس نے کہا آؤ،
اس نے کہا ٹھہرو
مسکاؤ کہا اس نے
مرجاؤ کہا اس نے
میں آیا،
میں ٹھہر گیا،
مسکایا
اور مر بھی گیا

٭ ناظم حکمت کی روسی بیوی

وا میرے وطن

او میرے وطن! او میرے وطن! او میرے وطن!

مرے سر پہ وہ ٹوپی نہ رہی

جو تیرے دیس سے لایا تھا

پاؤں میں وہ اب جوتے بھی نہیں

واقف تھے جو تیری راہوں سے

مرا آخری کرتا چاک ہُوا

ترے شہر میں جو سلوایا تھا

اب تیری جھلک

بس اُڑتی ہوئی رنگت ہے میرے بالوں کی

یا جھرّیاں میرے ماتھے پر

یا میرا ٹوٹا ہوا دل ہے

وا میرے وطن! وا میرے وطن! وا میرے وطن!

اولجز، عمر علی سلیمان

صحرا کی رات

کہیں بھی شبنم کہیں نہیں ہے
عجب کہ شبنم کہیں نہیں ہے
نہ سرد خورشید کی جبیں پر
کسی کے رُخ پر نہ آستیں پر
ذرا سی شبنم کہیں نہیں ہے
پسے ہوئے پتھروں کی موجیں
خموش و ساکن
حرارتِ ماہِ نیم شب میں سُلگ رہی ہیں

اور شبنم کہیں نہیں ہے
برہنہ پا غول گیدڑوں کے
لگا رہے ہیں بنوں میں ٹھٹھے

؂ قازقستان کا ممتاز نوجوان شاعر

وطنے دیاں ٹھنڈیاں چھائیں
چھڈ غیراں دے محل چوبارے
اپنے ویہڑے دی ریس نہ کائی
اپنی جھوک دیاں سکھ خیراں
تُس نے قدر نہ پائی

موڑ مہاراں
تے آ گھر باراں
مُڑ آ کے مُول نہ جائیں

او یار
ٹِک رہ جائیں او یار

اُٹھ اُتاں نوں جٹّا

مردا کیوں جانئیں

بھولیا توُں جگ دا اَن داتا

تیری باندی دھرتی ماتا

توُں جگ دا پالن ہار

تے مردا کیوں جانئیں

اُٹھ اُتاں نوُں جٹا

مردا کیوں جانئیں

جرنل، کرنل، صُوبیدار

ڈپٹی، ڈی سی، تھانیدار

سارے تیرا دِتا کھادن

تُوں جے نہ بیجیں، تُوں جے نہ گاہویں

بُھکّے بھانے سب مر جاون

اے چاکر تُوں سرکار

مردا کیوں جائیں

اُٹھ اُتاں تُوں جٹا

مردا کیوں جائیں

وِچ کچہری، چونکی، تھانے
کیہہ اَن بھول تے کیہہ سیانے
کیہہ اشراف تے کیہہ نمانے
سارے کھجّل خوار
مردا کیوں جانئیں
اُٹھ اُتاں نُوں جٹا
ایکا کرلو، ہو جؤ کٹھے
بُھل جاؤ اِنگڑ چِیمے چٹھے

آپ ہمارے کتابی سلسلے کا حصہ بن سکتے
ہیں مزید اس طرح کی شان دار،
مفید اور نایاب کتب کے حصول کے لئے
ہمارے وٹس ایپ گروپ کو جوائن کریں

ایڈمن پینل

عبداللہ عتیق : 03478848884

سدرہ طاہر : 03340120123

حسنین سیالوی : 03056406067

سبھے دا اِک پریوار
مردا کیوں جائیں

جے چڑھ آون فوجاں والے
توں وی چھویاں لمب کرالے
تیرا حق تری تلوار !
تے مرِدا کیوں جائیں
دے اللہ ہُو دی مار
تے مردا کیوں جائیں
اُٹھ اُتاں نوں
اُٹھ اُتاں نوں
جٹا
مردا کیوں جائیں

وَطنے دِیاں ٹھنڈیاں چھائیں

او یار

ٹِک رَو ہھتائیں او یار

روزی دیوے گا سائیں

او یار

ٹِک رَو ہھنائیں او یار

ہیر نوں چھڈ ٹُر گیوں رنجھیٹے

کھیڑیاں دے گھر پے گئے ہاسے

پِنڈ وِچ کڈھی ٹور شریکاں

یاراں دے ڈھے پئے منڈاسے

وِیراں دیاں ٹُٹ گیاں بانہیں

او یار

ٹِک رَو ھتائیں او یار

او یار

روزی دیوے گا سائیں

کانگ اُڈاون ماواں، بھیناں

ترے پاون لکھ ھزاراں

خیر مناون سنگی ساتھی

چرخے اوہلے روون مٹیاراں

ہاڑا کر دیاں سُنجیاں راہیں

او یار

ٹِک رَو ھتائیں او یار